الرسالہ

زیر سرپرستی
مولانا وحید الدین خان
صدر اسلامی مرکز

زندگی اس سے زیادہ قیمتی ہے کہ اس کو
مقصد اعلیٰ سے کم تر کسی چیز میں استعمال کیا جائے

نومبر ۱۹۸۶ شمارہ ۱۲۰

عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر

مولانا وحید الدین خاں کے قلم سے

اللہ اکبر	40/-	ایمانی طاقت	4/-
تذکیر القرآن جلد اوّل	80/-	اتحادِ ملت	4/-
الاسلام	25/-	سبق آموز واقعات	4/-
مذہب اور جدید چیلنج	25/-	زلزلۂ قیامت	5/-
ظہورِ اسلام	25/-	حقیقت کی تلاش	4/-
احیاءِ اسلام	20/-	پیغمبر اسلام	4/-
پیغمبرِ انقلاب	30/-	حقیقتِ حج	4/-
سوشلزم اور اسلام	25/-	آخری سفر	4/-
صراط مستقیم	25/-	اسلامی دعوت	4/-
اسلامی زندگی	20/-	خدا اور انسان	4/-
اسلام اور عصر حاضر	20/-	حل یہاں ہے	6/-
دین کیا ہے	3/-	سچّا راستہ	2/-
قرآن کا مطلوب انسان	6/-	دینی تعلیم	4/-
تجدید دین	4/-	حیاتِ طیبہ	4/-
اسلام دینِ فطرت	4/-	باغِ جنّت	4/-
تعمیرِ ملت	4/-	نارِ جہنّم	4/-
تاریخ کا سبق	4/-	تبلیغی تحریک	12/-
مذہب اور سائنس	6/-	دین کی سیاسی تعبیر	10/-
عقلیاتِ اسلام	4/-	عظمتِ قرآن	25/-
فسادات کا مسئلہ	2/-		
انسان اپنے آپ کو پہچان	2/-		
تعارف اسلام	4/-		
اسلام پندرھویں صدی میں	4/-		
راہیں بند نہیں	4/-		

Muhammad: The Prophet of Revolution	50/-
The Way to Find God	4/-
The Teachings of Islam	5/-
The Good Life	5/-
The Garden of Paradise	5/-
The Fire of Hell	5/-
Muhammad: The Ideal Character	4/
Man Know Thyself	4/-

مکتبہ الرسالہ سی - ۲۹ نظام الدین ویسٹ نئی دہلی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اردو، انگریزی میں شائع ہونے والا

الرسالہ

اسلامی مرکز کا ترجمان

شمارہ ۱۲۰ — نومبر ۱۹۸۶

فہرست

دعا	صفحہ ۲	الزام کافی نہیں	صفحہ ۲۰
دعوت کی اہمیت	۳	منافقت	۲۲
کائناتی نشانیاں	۴	ایک تقاضا	۲۵
شراب کی حرمت	۱۳	ایک سفر	۲۹
اقرار و انکار	۱۵	توحید اور شرک	۴۵
مردہ لوگ	۱۷	قیمت میں اضافہ	۴۴
یہ انسان	۱۸	خبرنامہ اسلامی مرکز	۴۶
فرق کا سبب	۱۹	ایجنسی الرسالہ	۴۸

دعا

اللّٰھم انی اعوذُ بك من الفقر والقلة والذلة واعوذُ بك من اَن اَظلِمَ او اُظلَمَ ۔

(نسائی)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے اللہ، میں تجھ سے معافی مانگتا ہوں محتاجی سے اور کمی سے اور ذلت سے۔ اور میں تجھ سے معافی مانگتا ہوں اس سے کہ میں ظلم کروں یا مجھ پر ظلم کیا جائے۔

دعا آدمی کی تڑپ کا اظہار ہے۔ دعا یہ ہے کہ آدمی کسی چیز کے لیے بے پناہ خواہش مند ہو، وہ اپنا پورا وجود اس کے لیے لگائے ہوئے ہو۔ اور پھر اسی کو وہ اپنے رب سے بھی مانگے۔ جب آدمی اپنے آپ کو ہمہ تن کسی چیز میں لگا دے تو اس کے بعد فطری طور پر ایسا ہوتا ہے کہ اسی کا وہ چرچا کرتا ہے، اسی کے لیے دعائیں اس کی زبان سے جاری ہونے لگتی ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ دعا سنجیدگی کی آخری حد پر جاکر نکلتی ہے۔ اب جو شخص حقیقی معنوں میں محتاجی سے بچنا چاہتا ہو وہ کبھی ایسا نہیں کرے گا کہ خود ایسا عمل کرے جو اس کو محتاجی کی طرف لے جانے والا ہو۔ جو شخص ناداری کو ایک نازک امتحان سمجھتا ہو وہ خود اپنے ہاتھوں اپنے آپ کو نادار بنانے والا عمل نہیں کرے گا۔ جو شخص ذلت سے ڈرتا ہو وہ کبھی ایسا اقدام نہیں کرے گا جس کا نتیجہ یہ ہو کہ وہ ذلت کی حالت میں جا پڑے۔ جو آدمی اپنے آپ کو ظالم کے خانہ میں نہ دیکھنا چاہتا ہو وہ کبھی خود سے ظالمانہ کارروائی نہیں کرے گا۔ جو شخص اپنے آپ کو مظلومی کی حالت میں دیکھنا نہ چاہے وہ ایسے معاملہ میں کبھی نہیں کود سکتا جو نتیجۃً اس کو مظلومی کی حالت میں پہونچا دینے والا ہو۔

جو شخص اپنی دعا میں سنجیدہ ہو وہ کبھی ایسا نہیں کر سکتا کہ جس چیز سے بچنے کے لیے وہ خدا سے دعا کرے، دعا کے بعد وہ خود اسی چیز میں ملوث ہو جائے۔ خدا سے وہ مشرق کی سمت میں سفر کی توفیق مانگے اور دعا سے فارغ ہوتے ہی اپنی سواری مغرب کی سمت میں دوڑا دے۔

دعوت کی اہمیت

وان احدٌ من المشرکین استجارك فاجره حتی یسمع کلام الله ثم ابلغه مامنه ذالك بانهم قوم لایعلمون (التوبة)

اور اگر مشرکین میں سے کوئی تم سے پناہ مانگے تو اس کو پناہ دو یہاں تک کہ وہ اللہ کا کلام سن لے۔ پھر اس کو اس کی امن کی جگہ پر پہونچا دو۔ یہ اس لیے کہ وہ لوگ علم نہیں رکھتے۔

عرب کے مشرکین جن سے آخری درجہ میں حالت جنگ قائم ہو چکی ہے، ان کے بارہ میں یہاں حکم دیا گیا کہ اگر ان میں سے کوئی شخص تمہارے پاس آئے اور اسلام کی بابت جاننا چاہے تو اس کو اپنی حفاظت میں رکھ کر موقع دو کہ وہ اسلام کو سمجھے۔ نہ دشمنی کی وجہ سے اس کو قتل کرو اور نہ جاسوس سمجھ کر اس کو بھگا دو۔ وہ پرسکون طور پر تمہارے درمیان رہے اور اسلام کی تعلیمات کو سمجھے۔ اس آیت کی تشریح کرتے ہوئے مفسر ابن کثیر لکھتے ہیں:

(ذالك بانهم قوم لایعلمون) ای انما شرعنا امان مثل هولاء لیعلموا دین الله وتنشر دعوة الله فی عباده

(تفسیر ابن کثیر، الجزء الثانی، صفحہ ۳۳۰)

(اس لیے کہ وہ علم نہیں رکھتے) یعنی اس قسم کے لوگوں کے لیے امان کا طریقہ ہم نے اس لیے مقرر کیا تاکہ وہ اللہ کے دین کو جانیں اور اللہ کی دعوت اس کے بندوں میں پھیلے۔

اس سورہ میں ایک طرف مشرکین سے برأت کا اعلان ہے اور ان کے قتل کا حکم ہے۔ گویا ان کی دشمنی اس آخری درجہ پر پہونچ چکی ہے جب کہ برداشت کی حد ختم ہو جاتی ہے۔ مگر اس وقت بھی یہ حکم دیا جا رہا ہے کہ اگر ان میں کا ایک شخص اسلام کی تحقیق کرنا چاہے تو اس کو تحقیق کا پورا موقع دیا جائے۔ ایک شخص کے دل میں اگر قبول حق کا کوئی جذبہ ہے تو اس جذبہ کو بروئے کار آنے کا موقع ملنا چاہیے۔ شدت کے باوجود نرمی، غصہ کے باوجود انصاف کی یہی صلاحیت ہے جو کسی شخص کو خدا کے دین کا داعی بناتی ہے۔

کائناتی نشانیاں

کائنات ایک آئینہ ہے جس میں اس کے خالق کا چہرہ نظر آتا ہے۔ اس اعتبار سے کائنات کی ہر چیز ایک نشانی ہے۔ ہر چیز ایک حقیقت کا جلوہ دکھا رہی ہے۔ اگر آدمی کے اندر دیکھنے کی صلاحیت ہو تو وہ ہر چیز میں ایک معنویت دیکھے گا۔ موجودہ دنیا اپنی پوری وسعتوں کے ساتھ اس کے لیے معرفت الٰہی کا عظیم خزانہ بن جائے گی۔

ریاضیاتی دنیا

کائنات بظاہر ایک ریاضیاتی کائنات ہے۔ کائنات ریاضی کے اصولوں کی حد تک منظم ہے۔ یہ موجودہ کائنات کا ایک ایسا پہلو ہے جو اس کے ہر حصہ میں نمایاں طور پر نظر آتا ہے۔

شہد کی مکھی حد درجہ صحت کے ساتھ مسدس اشکال کے چھتے بناتی ہے۔ ایٹم کے ذرات کی گیت انتہائی یکساں طور پر متعین ہوتی ہے۔ زمین کی دوطرفہ گردش اتنی صحت کے ساتھ ہوتی ہے کہ ہزاروں سال پہلے اور ہزاروں سال آگے تک کے کلنڈر بنائے جا سکتے ہیں۔ یہی کائنات کے تمام اجزاء کا حال ہے۔ کائنات کا ہر جزء اتنے محکم اصولوں کے مطابق عمل کرتا ہے کہ نہایت صحت کے ساتھ اس کے مستقبل کی پیشین گوئی کی جا سکتی ہے۔

کائنات کا یہ پہلو سائنس دانوں کو بے حد متاثر کرتا ہے۔ حتی کہ انھیں یقین ہو گیا ہے کہ پوری کائنات ایک ریاضیاتی ماڈل ہے، کسی چیز کو جب تک وہ ریاضیاتی طور پر نہ سمجھ لیں وہ گمان کرتے ہیں کہ ابھی انھوں نے اس کو سمجھا نہیں۔

سائنس داں عالم فطرت کی تحقیق کرتے ہیں۔ اگرچہ سائنس کے درجنوں شعبے ہیں، اور مختلف سائنس داں اپنے شعبوں میں الگ الگ تحقیق اور مطالعہ کا کام کرتے ہیں۔ تاہم ان کے کام کا اگر ایک مشترک عنوان دینا ہو تو وہ یہ ہوگا کہ ـــــ کائنات میں ریاضیاتی نظم کی تلاش:

Searching for mathematical order in the universe.

تمام سائنس دانوں کا یہ مشترک عقیدہ ہے کہ کائنات میں ریاضیاتی قطعیت کی حد تک نظم اور ترتیب ہے۔ ایک سائنس داں اپنی تحقیق پر اس وقت بالکل مطمئن ہو جاتا ہے جب کہ وہ

اپنی تحقیق کو ریاضیاتی سانچے میں ڈھال لے۔ ریاضیاتی تصدیق سائنس داں کے نزدیک اس کے نظریہ کی صداقت کا آخری ثبوت ہے۔

سائنس دانوں کی جماعت کائنات کے مطالعہ میں ریاضی کو اسی طرح استعمال کرتی ہے جس طرح سناروں کی جماعت سونے کے کاروبار میں کسوٹی کو۔ سنار کسوٹی کی تصدیق کے بعد سونے کا سونا ہونا مان لیتا ہے۔ اسی طرح سائنس داں ریاضی کی تصدیق کے بعد نظریہ کا صحیح نظریہ ہونا تسلیم کر لیتا ہے۔

ریاضیات اور کائناتی نظام کے درمیان یہ مطابقت کیوں ہے۔ بعض سائنس دانوں نے یہ سوال اٹھایا ہے۔ ان کے ایک طبقہ نے اس کا براہِ راست جواب دیئے بغیر اس کو مزید ایک سوال پر ختم کر دیا ہے ——— کیا کائنات ایک ریاضیاتی ذہن کی تخلیق ہے :

Was the universe created by a mathematical mind?

کچھ سائنس دانوں نے اس کا مثبت جواب دیا ہے۔ سر جیمز جینز فلکی طبیعیات کا ایک مشہور عالم ہے۔ اس نے ۱۹۳۲ میں کہا کہ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کائنات کا نقشہ ایک خالص ریاضی داں نے تیار کیا تھا :

In 1932, Sir James Jeans, an astrophysicist siad: "the universe appears to have been designed by a pure mathematician."
Encyclopaedia Britannica (1984) V. 15. p. 531.

کائنات اور انسان

موجودہ اندازہ کے مطابق کائنات میں کم از کم دس ارب کہکشائیں ہیں۔ ہر کہکشاں میں تقریباً ایک کھرب ستارے ہیں۔ ان میں سے اکثر ستارے ہمارے سورج سے بہت زیادہ گرم اور بہت زیادہ بڑے ہیں جبکہ ہمارا سورج اتنا بڑا ہے کہ اس سے زمین جیسے بارہ لاکھ کرے بنائے جا سکتے ہیں یہ ان گنت متحرک ستارے ایک دوسرے سے اتنے زیادہ دوری پر ہیں جیسے بحر الکاہل میں بکھرے ہوئے چند سمندری جہاز۔ اس ناقابل قیاس حد تک بڑی دنیا میں زمین کا چھوٹا سا کرہ ایک انتہائی نادر استثنا ہے جہاں پانی اور ہوا اور وہ دوسری چیزیں ہیں جو انسان جیسی مخلوق کے لیے زندگی کا سامان

بن سکیں ـــــ یہ دنیا اپنی ساری عظمتوں اور حکمتوں کے باوجود انسان کے بغیر بالکل بے معنی ہے۔ مگر خود انسان کی زندگی اتنی زیادہ بے معنی معلوم ہوتی ہے کہ ساری کائنات میں بظاہر اس سے زیادہ بے معنی کوئی چیز نہیں۔

انسان اگر نہ ہو تو یہاں کوئی آنکھ نہ ہوگی جو دنیا کی رنگینیوں کو دیکھے اور کوئی کان نہ ہوگا جو اس کے نغموں کو سنے اور کوئی دماغ نہ ہوگا جو اس کی حکمت اور معنویت کو پائے۔ یہ دنیا ایک عظیم ترین آرٹ ہے مگر انسان کے بغیر وہ ایک ایسا آرٹ ہے جس کا کوئی جاننے والا نہیں۔ جس کی کوئی داد دینے والا نہیں۔

مگر خود انسان کی حقیقت کیا ہے۔ زمین پر جتنے انسان پائے جاتے ہیں، اگر ان میں کا ہر شخص چھ فٹ لمبا، ڈھائی فٹ چوڑا اور ایک فٹ موٹا ہو تو انسان کی پوری آبادی کو بہ آسانی ایک ایسے صندوق میں بند کیا جا سکتا ہے جو لمبائی چوڑائی اور بلندی میں ایک میل ہو۔ کائنات کی وسعتوں کے مقابلہ میں یہ صندوق کس قدر چھوٹا ہے۔ پھر اگر اس کو کسی سمندر کے کنارے لے جا کر ایک ہلکا سا دھکا دیں تو یہ صندوق پانی کی گہرائی میں اس طرح گم ہو جائے گا جیسے بھری ہوئی بالٹی میں سرسوں کا ایک دانہ۔ صدیاں گزر جائیں گی، نسل انسانی اپنے مادی کفن میں لپٹی ہوئی ہمیشہ کے لیے پڑی رہے گی۔ دنیا کے ذہن سے یہ بھی محو ہو جائے گا کہ یہاں کبھی انسان جیسی کوئی مخلوق آباد تھی۔ سمندر کی سطح پر اسی طرح طوفان آتے رہیں گے۔ سورج اسی طرح چمکتا رہے گا۔ زمین کا کرہ بدستور اپنے محور پر گھومتا رہے گا۔ کائنات کی لامحدود پہنائیوں میں پھیلی ہوئی ان گنت دنیائیں اس حادثہ کو بس اتنی ہی اہمیت دیں گی جیسے زمین کے اوپر ایک چیونٹی کا کچل کر مر جانا۔ صدیوں کے بعد سمندر کے کنارے مٹی کا ایک ڈھیر زبان حال سے بتائے گا کہ یہ نسل انسانی کی قبر ہے جہاں وہ صدیوں پہلے ایک صندوق میں دفن کی گئی تھی۔ انسان باعتبار حقیقت انتہائی بامعنی ہے۔ مگر انسان کائنات کے موجودہ نظام میں اپنی معنویت کو نہیں پاتا۔ یہاں انسان کی تمنائیں پوری نہیں ہوتیں۔ موجودہ دنیا اپنی تکمیل کے لیے ایک اور دنیا کی طالب ہے۔ موجودہ دنیا اپنی ساری معنویت کے باوجود بے معنی ہے اگر اس کے ساتھ آخرت کو نہ مانا جائے۔

توازن فطرت

قطب جنوبی (انٹارکٹکا) کے بارہ میں روسی جغرافیہ سوسائٹی نے تحقیقات کی ہیں۔ انھوں

نے اندازہ لگایا ہے کہ قطب جنوبی کے اوپر جو برف جمی ہوئی ہے وہ دنیا بھر کے تازہ پانی کا ۸۵ فی صد حصہ ہے۔ اس کی مقدار ڈھائی کروڑ مکعب میٹر ہے۔ قطب جنوبی کی برف اس وقت صرف ڈیڑھ کروڑ مربع میٹر کے علاقہ میں پھیلی ہوئی ہے۔

اگر اس برف کو دنیا کے تمام خشک حصہ پر پھیلا دیا جائے تو موجودہ خشک زمین پر ۵۰ میٹر برف جم جائے گی۔ اور اگر یہ برف اچانک پگھل جائے تو دنیا کے سمندروں کی سطح ۶۰ سے ۷۰ میٹر تک بلند ہو جائے گی۔ اور زمین کا دس فی صد حصہ زیر آب ہو جائے گا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ دنیا بھر کے تمام ساحلی شہر پانی کے نیچے ڈوب جائیں گے۔ حتی کہ بہت سے ملک پورے کے پورے پانی کے نیچے چلے جائیں گے۔ قطب جنوبی کی تمام برف پگھلنے کی صورت میں سمندر کی اوسط حرارت دو ڈگری کم ہو جائے گی۔ اس کی وجہ سے زمین پر موسمی تباہی آجائے گی۔ کیوں کہ سمندر میں ایک ڈگری کے ہزارویں حصہ کی کمی بیشی فضا میں پوری ایک ڈگری کی حرارت کا فرق پیدا کرتی ہے۔

یہ ایک چھوٹی سی مثال ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ زمین پر جو نظام ہے وہ کس قدر متوازن نظام ہے۔ یہاں بیک وقت مختلف تقاضوں کے درمیان اس طرح توازن قائم رکھا گیا ہے کہ ہر چیز صرف اپنا فائدہ دے، وہ اپنے نقصان سے انسان کو بچائے رکھے۔

یہ توازن فطرت زمین کے ہر معاملہ میں نمایاں ہے۔ یہ واضح طور پر بتاتا ہے کہ اس دنیا کے پیچھے ایک ذہن کارفرما ہے۔ اگر یہاں ذہن کی کارفرمائی نہ ہو تو موجودہ توازن کسی حال میں برقرار نہیں رہ سکتا۔

زمین کا مطالعہ کرتے ہوئے واضح طور پر ایسا معلوم ہوتا ہے گویا جس ہستی نے زمین کے موجودہ حالات کو ایک خاص ڈھنگ پر بنایا ہے اس کو معلوم تھا کہ یہاں جاندار چیزیں (انسان، حیوان، نباتات) ہیں۔ چنانچہ یہاں کی ہر چیز جاندار اشیاء کی ضرورت کے عین مطابق بنائی گئی ہے اگر یہ واقعہ آدمی کو خدا کا یقین نہ دلائے تو آخر وہ کیا چیز ہوگی جو آدمی کو اس کا یقین دلائے گی۔

نیم کا معجزہ

دوسری انٹرنیشنل نیم کانفرنس دسمبر ۱۹۸۳ میں مغربی جرمنی میں ہوئی۔ آج کل نیم کا درخت نباتاتی علماء کی خصوصی توجہ کا مرکز بنا ہوا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ نیم مضر کیڑوں کو بھگانے والا ایک

قیمتی قدرتی ذریعہ (Natural repellent) ہے۔ انسان نے کیمیائی طور پر جتنی کیڑا مار دوائیں بنائی ہیں وہ سب کیڑے پر اثر انداز ہونے کے ساتھ فضا کو بھی خراب کرتی ہیں اور اس طرح انسان کے لیے مضر بنتی ہیں۔ مگر نیم کے اندر یہ انوکھی صفت ہے کہ وہ کسی فضائی نقصان (Environmental damage) کے بغیر انسان کو اور نباتات کو مضر کیڑوں سے بچاتی ہے۔

مذکورہ کانفرنس میں ۲۱ ملکوں کے ایک سو سے زیادہ سائنس داں جمع ہوئے۔ ہر ایک نے اپنے اپنے دائرہ میں نیم کے تجربات بتائے۔ ہالینڈ سے آنے والے ایک عالم ایل ایم اسچون ہیون (Dr. L.M. Schoonhoven) نے اپنے مقالہ میں بتایا کہ نیم کے اندر ایک انوکھا دفاعی نظام (Unique defence system) ہے۔ یہ نظام ایک بے حد نادر قسم کا کیڑا کنٹرول (Insect control) ذریعہ ہے۔ انھوں نے بتایا کہ ٹوگو (Togo) میں یہ تجربہ کیا گیا کہ کھیت کی مٹی میں نیم کی پتی ملا دی گئی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نباتاتی کیڑوں (Plant parasites) کی تعداد بہت گھٹ گئی۔ اور ایسے کھیت جن میں یہ عمل کیا گیا تھا، فصل کی پیداوار میں نمایاں اضافہ (Spectacular increase) ہوا۔

ہندستان کے نمائندہ نے اپنے مقالہ میں بتایا کہ نیشنل کیمیکل لیبارٹری (پونا) نے نیم کا ایک کمپاؤنڈ تیار کیا ہے جس کا نام نیمرچ (Neemrich) ہے۔ مکا، آلو اور بعض دوسری فصلوں میں نیمرچ کے تجربے کیے گیے جس کے نتیجہ میں ان کی پیداوار میں قابل لحاظ اضافہ ہوا۔

موجودہ زمانہ میں دنیا کے تمام ملکوں میں کیڑا مار دواؤں (Pesticides) کا استعمال عام ہے ان دواؤں کے استعمال سے یقیناً زرعی پیداوار میں اضافہ ہوا ہے۔ مگر ابھی تک انسان یہ دریافت نہ کر سکا کہ ان دواؤں کے استعمال سے فضا پر جو مضر اثرات ہوتے ہیں ان سے کس طرح بچا جائے۔ یہ کیڑا مار دوائیں اگر ایک طرف کیڑے کو مارتی ہیں تو اسی کے ساتھ وہ انسان کو بھی نقصان پہونچاتی ہیں۔

اگر آپ لکڑی اور پتی کو آگ میں ڈالیں تو دونوں جل جائیں گی۔ کیوں کہ اصل کے اعتبار سے دونوں ایک ہیں۔ اسی طرح انسان اور کیڑے دونوں زندہ انواع ہیں۔ جو چیز ایک کے لیے نقصان دہ ہے وہی دوسرے کے نقصان کا باعث بھی ہوتی ہے۔

انسان کو مضر بیکٹیریا سے بچانے کے لیے اینٹی بایوٹک دوائیں کھلائی جاتی ہیں۔ یہ دوائیں

بیکٹیریا کی طرح انسان کے جسم کے لیے بھی نقصان دہ ثابت ہوتی ہیں۔ مکھی، مچھر، دیمک اور دوسرے کیڑوں کو ختم کرنے کے لیے ڈی ڈی ٹی چھڑکا جاتا ہے۔ اس سے مذکورہ کیڑے بھاگتے ہیں یا مر جاتے ہیں۔ مگر اسی کے ساتھ فضا میں ڈی ڈی ٹی کے اجزا شامل ہو جاتے ہیں۔ انسان سانس کے ذریعہ ان کو اپنے اندر داخل کر لیتا ہے اور پھر طرح طرح کے امراض کا شکار ہوتا ہے۔ پھل اور زرعی پیداوار میں مضر کیڑے لگتے ہیں جن سے پیداوار بہت کم ہو جاتی ہے۔ اس کے لیے کیڑا مار دوائیں بنائی گئی ہیں۔ ان دواؤں کے استعمال سے باغوں اور کھیتوں کی پیداوار میں قابل لحاظ اضافہ ہوا ہے مگر یہاں بھی وہی صورت ہے کہ ایک طرف ان کیڑا مار دواؤں سے فضا خراب ہوتی ہے، دوسری طرف خود پیداوار میں مضر کیمیائی مادے شامل ہو جاتے ہیں اور کھانے کے ساتھ انسان کے اندر داخل ہو کر نقصان کا سبب بنتے ہیں۔

ہندستان میں ہر سال تقریباً چالیس ہزار پونڈ کیمیکل دوائیں زرعی کھیتوں میں چھڑکی جاتی ہیں۔ اس کے نتیجہ میں عوام کی صحت کا معیار برابر گر رہا ہے۔ ورلڈ ہیلتھ آرگنائزیشن کی رپورٹ (۱۹۸۳) میں بتایا گیا ہے کہ تیسری دنیا کے ملکوں میں زرعی کیڑوں کو مارنے کے لیے جو کیمیائی دوائیں استعمال ہوتی ہیں ان کے زہریلے اثرات سے ہر سال تقریباً پچاس ہزار آدمی بیمار پڑتے ہیں اور ان میں سے تقریباً پانچ ہزار آدمی مر جاتے ہیں۔

انسانی سائنس ابھی اس سائنس تک بھی نہیں پہونچی جس کا مظاہرہ قدرت کے اس معجزہ کی سطح پر ہو رہا ہے جس کو نیم کا درخت کہتے ہیں۔ اس کے باوجود بہت سے لوگ یہ فرض کیے ہوئے ہیں کہ اس دنیا کا کوئی خالق و مالک نہیں، اس دنیا کو چلانے والا کوئی ذہن نہیں۔

"ڈی ڈی ٹی" کا ایک پیکٹ ہو تو اس کو دیکھ کر کوئی شخص یہ نہیں کہے گا کہ یہ پیکٹ اپنے آپ بن گیا ہے۔ ہر آدمی اس کو ذہن کی تخلیق قرار دے گا۔ مگر ڈی ڈی ٹی کی نوعیت کی اس سے زیادہ اعلیٰ پیداوار کو دیکھ کر آدمی یہ کہہ دیتا ہے کہ وہ اپنے آپ وجود میں آگئی ہے۔ نیم کا درخت بلاشبہ ڈی ڈی ٹی سے بہت زیادہ اعلیٰ پیداوار ہے۔ اس کی بناوٹ میں یقینی طور پر غیر معمولی ذہانت پائی جاتی ہے۔ پھر کیسے عجیب ہیں وہ لوگ جو ڈی ڈی ٹی کے بارہ میں یہ مانتے ہیں کہ وہ ذہانت کی پیداوار ہے۔ مگر یہی بات وہ نیم جیسی چیزوں کے بارہ میں نہیں مانتے۔

تخلیق میں ذہانت

شہد کی مکھی پھولوں کا رس چوس کر شہد تیار کرتی ہے۔ مگر شہد کی مکھی کا صرف اتنا ہی کام نہیں۔ اسی کے ساتھ وہ اور بھی کئی اہم کام انجام دیتی ہے۔ انھیں میں سے ایک کام زرخیزی ہے۔ یعنی نر اور مادہ کے زیرہ کو ایک دوسرے پر پہونچانا تاکہ وہ زرخیز ہو سکیں۔ یہ کام اتنا اہم ہے کہ شہد کی مکھی کے ایک ماہر نے لکھا ہے کہ پھولوں کا رس وہ معاوضہ ہے جو پودا شہد کی مکھیوں کو زرخیز بنانے کے عمل کے لیے ادا کرتا ہے :

Nectar is the fee paid by the plant for the fertilizing service of the insect (bees).

امریکہ کے مشرقی حصہ میں پھولوں کے رس Nectar کا نوے فی صد حصہ بے کار چلا جاتا ہے۔ کیوں کہ اس علاقہ میں شہد کی مکھیاں بہت کم پائی جاتی ہیں۔ اور اسی نسبت سے زرخیزی کا عمل بھی نسبتاً کم انجام پاتا ہے۔

معلوم کیا گیا ہے کہ شہد کی مکھی جب کسی باغ یا کیاری میں پھولوں کا رس چوس رہی ہو تو وہ بیک وقت ہر قسم کے درختوں کے پھولوں کا رس نہیں چوستی۔ بلکہ وہ یہ کرتی ہے کہ جس پھول کا رس ایک بار لیا ہے، اسی کا رس بار بار لیتی ہے۔ وہ ایک وقت میں ایک ہی نسل کے پھولوں کے درمیان اڑ کر ایک کے بعد ایک کا رس لیتی رہتی ہے۔

شہد کی مکھی کا یہ طریقہ زراعت اور باغبانی کے لیے بے حد اہم ہے۔ اس کی وجہ سے وہ ایک مخصوص پھول کے زیرہ کو اسی مخصوص درخت کے پھولوں تک پہونچاتی رہتی ہے۔ پھول چوسنے کے دوران پھول کا زیرہ اس کے جسم سے چپک جاتا ہے۔ جب وہ دوسرے پھول پر جا کر بیٹھتی ہے تو اس کا زیرہ اس پھول پر گر جاتا ہے۔ اس طرح نر اور مادہ کے درمیان زرخیزی کا عمل انجام پاتا ہے۔ اور ان میں تزویج کا عمل جاری رہتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو تقریباً ایک لاکھ قسم کے پودے زمین سے بالکل ختم ہو جائیں۔

یہ واضح طور پر تخلیق کے نظام میں ذہانت ہونے کا ثبوت ہے۔ اس قسم کا بامعنی واقعہ لازمی طور پر ثابت کرتا ہے کہ اس دنیا کا ایک خالق ہے۔ اگر خالق نہ ہو تو تخلیق کے نظام میں اس قسم کی معنویت ممکن نہیں۔

ہوابازی کے قانون کے مطابق بارہ ہزار پاؤنڈ سے زیادہ وزنی ہوائی جہازوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے ساتھ بلیک باکس رکھیں۔ بلیک باکس دو چھوٹے چھوٹے خاص قسم کے ٹیپ ریکارڈر ہیں۔ جس میں سے ایک کو فلائٹ ریکارڈر اور دوسرے کو وائس ریکارڈر کہا جاتا ہے۔ ان میں سے ہر ایک اوسطاً ۲۰ انچ لمبا اور ۶ انچ چوڑا ہوتا ہے۔ اس کا وزن کم و بیش ۲۵ پاونڈ ہوتا ہے یہ دونوں ریکارڈر ہوائی جہاز کی دم میں رکھ دیئے جاتے ہیں تاکہ حادثہ کے وقت محفوظ رہ سکیں وہ مخصوص نظام کے تحت پائلٹ کی آواز، جہاز کی رفتار اور دوسری ضروری معلومات ریکارڈ کرتے رہتے ہیں۔ ان کا ٹیپ آٹومیٹک طور پر ہر آدھ گھنٹہ میں مٹ جاتا ہے تاکہ جہاز کے آخری لمحات کا حال ان سے معلوم ہو سکے۔

۲۳ جون ۱۹۸۵ کو ایک سخت ہوائی حادثہ ہوا۔ ایر انڈیا کا ایک بڑا جہاز (بوئنگ ۷۴۷) کناڈا سے لندن ہوتا ہوا ہندستان آرہا تھا۔ زمینی کنٹرول جہاز کی لمحہ لمحہ رپورٹ لے رہا تھا۔ اچانک اس کی کمپیوٹر اسکرین پر جہاز کی تصویر غائب ہو گئی۔ جہاز سے پیغامات آنا بالکل بند ہو گیے۔ جہاز ایک حادثہ کا شکار ہو کر اچانک اٹلانٹک سمندر میں گر پڑا تھا۔ جہاز پر ۳۲۹ مسافر تھے جو سب کے سب ہلاک ہو گیے۔ ان میں سے کوئی بھی زندہ نہ بچا جو حادثہ کی تفصیلات دنیا والوں کو بتا سکے۔

اب حادثہ کی بابت معلوم کرنے کا ذریعہ صرف وہ بلیک باکس تھا جو اٹلانٹک سمندر میں تہہ نشین ہو کر رہ گیا تھا۔ اٹلانٹک سمندر دنیا کا دوسرا سب سے بڑا سمندر ہے۔ اس کا رقبہ چھوٹے چھوٹے ذیلی سمندروں کو ملا کر چار کرور گیارہ لاکھ مربع میل ہے۔ اس ناپیدا کنار سمندر میں بلیک باکس کی حیثیت صرف ایک چھوٹے سے ذرہ کی تھی جو سمندر کے نیچے دو میل کی گہرائی میں پڑا ہوا تھا۔ بظاہر اس ذرہ کو سمندر سے نکالنا ناممکن تھا۔ مگر یہ ناممکن ممکن ہو گیا اور ۱۰ جولائی ۱۹۸۵ کو وائس ریکارڈر اور ۱۱ جولائی ۱۹۸۵ کو فلائٹ ریکارڈر گہرے سمندر کی تہہ سے نکال لیا گیا۔

یہ معجزہ کیسے پیش آیا۔ وہ ریڈیائی لہروں کے ذریعہ کنٹرول کیے جانے والے مشینی انسان

(Remote-controlled Robot) کے ذریعہ پیش آیا۔ بلیک باکس میں ایسی مشینیں ہوتی ہیں جن کے ذریعہ وہ ریڈیائی سگنل بھیجتا رہتا ہے۔ یہ سگنل اس سے ہر سکنڈ میں نکلتے ہیں اور تیس دن تک جاری رہتے ہیں۔ فرانس اور امریکہ اور برطانیہ کی جدید سامان سے مسلح کشتیوں نے سگنل کے ذریعہ ان کے جائے وقوع کا ٹھیک ٹھیک پتہ لگالیا۔ اس کے بعد مخصوص کیمرہ کے ذریعہ اس کی تصویریں لی گئیں۔ پھر مشینی انسان (Robot) سمندر کی تہہ میں بھیجے گیے۔ جو انسان کی مانند بازو اور ہاتھ اور انگلیاں رکھتے ہیں۔ یہ روبوٹ ریڈیائی لہروں سے کنٹرول ہوتے ہیں۔ انسان سمندر کے اوپر مشینی اسکرین پر سارا منظر دیکھتا ہے اور ریڈیائی لہروں کے ذریعہ روبوٹ کی رہنمائی کرتا ہے تاکہ وہ متعین مقام پر پہونچ کر بلیک باکس کو اپنے ہاتھوں سے پکڑلیں اور پھر اوپر لاکر انسان کے حوالے کر دیں۔

یہ طریقہ تھا جس کو استعمال کر کے اتھاہ سمندر سے ایک چھوٹے سے ذرہ کو نکال لیا گیا اور اس نے جہاز کے حادثہ کی ساری کہانی انسان کو بتادی۔

جب میں نے اخبارات میں ان تفصیلات کو پڑھا تو مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے اِس واقعہ کی صورت میں اُس عظیم تر واقعہ کا اظہار (Demonstration) دیا جارہا ہے جو قرآن میں ان لفظوں میں بیان ہوا ہے:

وما یعزب عن ربک من مثقال ذرة فی الارض ولا فی السماء ولا اصغر من ذالک ولا اکبر الا فی کتاب مبین (یونس ٦١)

اور تیرے رب سے کوئی چیز ذرہ برابر بھی غائب نہیں، نہ زمین میں اور نہ آسمان میں اور نہ اس سے چھوٹی اور نہ اس سے بڑی، مگر وہ ایک واضح نوشتہ میں ہے۔

الرسالہ کیسٹ

الرسالہ کیسٹ نمبر ۷ زیر تیاری ہے۔ انشاء اللہ بہت جلد اس کی روانگی شروع ہوجائے گی۔

منیجر

شراب کی حرمت

نئی دہلی کے ایک انگریزی روزنامہ انڈین اکسپریس (۹ اگست ۱۹۸۶) کے صفحہ اول پر ایک تصویر ہے جس میں بہت سے آدمی افسردہ چہروں کے ساتھ اس حال میں بیٹھے ہوئے ہیں کہ ان کے پیروں پر پلاسٹر چڑھا ہوا ہے۔ یہ چندی گڑھ کے آگ بجھانے والے محکمہ کے سرکاری ملازمین ہیں۔ ان کے افسر مسٹر آر کے رنگا (ڈپٹی کمشنر اور ڈائرکٹر آف فائر سروسز) نے ان کو بلندی سے کودنے کا حکم دیدیا تھا جس کے نتیجہ میں ان کے پاؤں یا تو ٹوٹ گیے یا شدید طور پر زخمی ہوئے۔

مسٹر رنگا کا کہنا ہے کہ انھوں نے یہ حکم ان ملازمین کی جسمانی صحت (Physical fitness) کی جانچ کے لیے دیا تھا۔ دوسری طرف شائع شدہ رپورٹ کا ایک حصہ یہ ہے ـــــ مسٹر رنگا نے آگ بجھانے والے آدمیوں کو حکم دے دیا کہ وہ دس فٹ اونچے فائر انجن کی چھت سے کود دیں۔ ان آدمیوں کا کہنا ہے کہ مسٹر رنگا نے یہ حکم اس لیے دیا کہ وہ اس وقت شراب پی کر مدہوش ہو رہے تھے:

Mr Ranga ordered the firemen to jump from the roof of a 10-feet high fire-engine. The firemen allege that he was drunk.
Indian Express (New Delhi) August 9, 1986 p. 7

یہ ایک حقیقت ہے کہ شراب اور جرم کا بہت گہرا تعلق ہے۔ شراب انسان کی عقل کو ماؤف کر دیتی ہے۔ شراب پینے کے بعد آدمی کوئی بھی غیر معقول حرکت کر سکتا ہے۔ یہ ثابت ہوا ہے کہ سڑک کے حادثات زیادہ تر شراب نوشی کی وجہ سے واقع ہوتے ہیں۔

انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا (۱۹۸۴) میں بتایا گیا ہے کہ شراب نوشی پر ایک خاص اعتراض یہ ہے کہ شراب پی کر گاڑیاں چلانے کے سبب سے سڑک کے حادثات بہت بڑھ گیے ہیں، اس کے نتیجہ میں لوگ مرتے ہیں، زخمی ہوتے ہیں اور جائداد کا نقصان ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر امریکہ میں ہر سال ۵۰ ہزار سڑک کے حادثات ہوتے ہیں۔ ان میں سے ایک تہائی حادثات کا سبب ـــــ شراب نوشی ہے۔ ان میں تقریباً پانچ لاکھ آدمی زخمی ہوتے ہیں اور ایک ارب ڈالر سے زیادہ جائداد کو نقصان پہونچتا ہے:

A special offense related to drinking is alcohol-impaired driving of motor vehicles and the resulting high rate of accidents, with fatalities, personal injuries, and property damage. Alcohol, for example, is involved in about one-third of the more than 50,000 annual road traffic fatalities in the United States, in possibly 500,000 injuries to persons, and in more than $ 1,000,000,000 worth of property damage (1/449).

ٹائمس آف انڈیا (۶ نومبر ۱۹۸۵) میں ایک رپورٹ چھپی تھی جس کا عنوان تھا جرم سے پہلے شراب پیو (Drink before crime) اس رپورٹ میں بتایا گیا تھا کہ امریکہ میں جو لوگ جیل خانوں میں ہیں اور جن پر متشددانہ جرم کرنے کا الزام ہے، ان کی آدھی سے زیادہ تعداد وہ ہے جس نے جرم کرنے سے پہلے شراب پیا تھا۔ مجرمانہ افعال کے سلسلہ میں شراب کے رول کا زبردست مطالعہ کرنے کے بعد امریکہ کے محکمہ انصاف کے شعبہ اعداد و شمار نے بتایا ہے کہ ۳۲۱۱۲ سنگین مجرمین میں سے ۵۴ فی صد ایسے افراد پائے گئے جو کہ جرم کے وقت شراب پیے ہوئے تھے:

More than half of jail inmates convicted of violent crimes had been drinking before committing the offences, says an official report. In a grim study of alcohol's role in fueling crimes a report by the U.S. bureau of justice statistics showed that altogether, 54 per cent of 32,112 people convicted of violent crimes had been drinking, reports AP.

یہ ایک حقیقت ہے کہ شراب ام الخبائث ہے۔ یعنی تمام برائیوں کی جڑ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ شراب آدمی کے سوچنے اور محسوس کرنے کی صلاحیت کو ماؤف کر دیتی ہے۔ آدمی کے اندر ایک احساس چھپا ہوا ہے جو اس کو صحیح اور غلط بتاتا ہے اور انجام اور بدانجامی سے متنبہ کرتا ہے۔ یہ احساس جرم کو روکنے کے لیے سب سے بڑا محرک ہے۔ شرمندگی کا احساس، جرم کے نتیجہ کا خوف، دوسرے انسانوں کے لیے مہربانی۔ اس قسم کے احساسات ہر آدمی کے اندر فطری طور پر موجود ہیں اور وہ جرم کو روکنے میں زبردست عامل کا کام کرتے ہیں۔ مگر شراب آدمی کو نشہ میں مبتلا کر کے اس کو بے حس بنا دیتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ آسمانی شریعت میں شراب کو مطلق حرام قرار دیا گیا ہے۔ حتی کہ اس کی تھوڑی سی مقدار جو بظاہر بے ضرر معلوم ہوتی ہے وہ بھی حرام ہے۔ ایسا اس لیے ہے تاکہ شراب سے مکمل کراہیت پیدا ہو

اقرار و انکار

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب مکہ کے لوگوں (قریش) کے سامنے اسلام کی دعوت پیش کی تو وہ ان کے لیے قابل قبول نہ ہو سکی۔ ان کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی تھی کہ محمد بن عبداللہ کا دین صحیح ہو اور وہ دین غلط ہو جن کو وہ اپنے اکابر و اسلاف کی طرف منسوب کر کے اس پر فخر کر رہے تھے۔ انھوں نے کہا:

یامحمد، فسل لنا ربّك الذی بعثك بما بعثك به، ولیبعث لنا من مضیٰ من اٰبائنا ولیکن فیمن یبعث لنا منهم قصیّ بن کلاب فانه کان شیخ صدقٍ فنسألهم عما تقول اَحقّ هو اَمْ باطل فان صدقوك صدقناك وعرفنا به منزلتك من اللّٰه تعالیٰ وانه بعثك رسولاً کما تقول۔

(سیرۃ ابن ہشام، الجزء الاول، صفحہ ۳۱۶)

اے محمد، اپنے رب سے کہو جس نے تم کو بھیجا ہے جس چیز کے ساتھ بھیجا ہے۔ کہ وہ ہمارے گزرے ہوئے آبار کو اٹھائے۔ اور جن لوگوں کو وہ اٹھائے ان میں قصی بن کلاب بھی ہوں۔ کیوں کہ وہ ایک سچے بزرگ تھے۔ پھر ہم ان سے پوچھیں کہ جو کچھ تم کہتے ہو وہ حق ہے یا باطل ہے۔ اگر وہ لوگ تمہاری تصدیق کریں تو ہم بھی تمہاری تصدیق کریں گے اور اس سے ہم اللہ کے نزدیک تمہارے درجہ کو پہچان لیں گے اور یہ کہ اس نے تم کو رسول بنا کر بھیجا ہے جیسا کہ تم کہتے ہو۔

کیا وجہ ہے کہ "قصی بن کلاب" کی بڑائی قریش کی سمجھ میں آئی مگر محمد بن عبداللہ کی بڑائی ان کی سمجھ میں نہ آسکی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ قصی بن کلاب ایک گزری ہوئی شخصیت تھے۔ اور محمد بن عبداللہ ان کے لیے حال کی شخصیت تھے۔

قصی بن کلاب کی بڑائی انھوں نے بچپن سے سنی تھی۔ ان کے ذہن میں یہ بات مسلّم ہو چکی تھی کہ قصی بن کلاب ایک عظیم شخصیت ہیں۔ اس کے برعکس محمد بن عبداللہ کو انھوں نے پہلی بار ایک معمولی آدمی کی حیثیت سے دیکھا۔ قصی بن کلاب سے ان کا پہلا تعارف بڑے آدمی کی حیثیت سے ہوا اور محمد بن عبداللہ سے ان کا پہلا تعارف چھوٹے آدمی کی حیثیت سے۔

یہی فرق تھا جس نے ان کی نظر میں ایک کو بڑا اور دوسرے کو چھوٹا بنا دیا۔

ہمیشہ یہی ہوتا ہے کہ آدمی اس شخص کی بڑائی فوراً مان لیتا ہے جو اس کے سن شعور کو پہونچنے سے پہلے بڑا بن چکا ہو۔ اور جو شخص اس کی نگاہوں کے سامنے بڑا بنا ہو اس کی بڑائی کو وہ تسلیم نہیں کرتا۔

اسی نفسیات کا ایک پہلو حسد ہے۔ حسد ہمیشہ حال کے اکابر سے ہوتا ہے نہ کہ ماضی کے اکابر سے۔

قرآن میں اہل ایمان کی صفت یہ بتائی گئی ہے کہ وہ غیب پر ایمان لاتے ہیں (یؤمنون بالغیب)۔ اس آیت کا تعلق براہ راست طور پر ایمان باللہ سے ہے، مگر بالواسطہ طور پر اس کا تعلق ایمان بالرسول سے بھی ہو جاتا ہے۔ رسول جب آتا ہے تو باعتبار "بشر" وہ ظاہر ہوتا ہے، مگر باعتبار "رسول" وہ غیب میں ہوتا ہے۔ بشر ہونے کی حیثیت سے وہ ہر ایک کو دکھائی دیتا ہے، مگر رسول ہونے کی حیثیت سے اس کو صرف وہ لوگ دیکھ پاتے ہیں جو اس کو اس کے اندرونی جوہر کے اعتبار سے پہچاننے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔

رسول کا ایک جسم ہوتا ہے۔ وہ چلتا پھرتا ہے اور کھانا کھاتا ہے۔ وہ فتح و شکست سے دوچار ہوتا ہے، اس پر مختلف قسم کے مادی حالات طاری ہوتے ہیں۔ ان حیثیتوں میں رسول ایک نظر آنے والی چیز ہوتا ہے۔ ان حیثیتوں سے ہر آدمی رسول کو دیکھتا ہے۔ رسول کی دوسری حیثیت یہ ہوتی ہے کہ اس پر خدا کا فیضان اترتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ میں نے جنت اور جہنم کو دیکھا ہے۔ اس کا دعویٰ ہوتا ہے کہ جو شخص میرا ساتھ دے گا وہ کامیاب ہوگا اور جو شخص میرا ساتھ نہیں دے گا، وہ ناکام ہو کر رہ جائے گا۔ اس دوسری حیثیت میں رسول بھی اسی طرح غیر مرئی ہوتا ہے جس طرح خدا۔

رسول کو رسول کی حیثیت سے پہچاننے کے لیے بھی "غیب" کو دیکھنے والی نظر درکار ہے۔ جو لوگ چیزوں کو ان کے جوہر کے اعتبار سے دیکھ سکیں، جو چیزوں کو ان کی اندرونی حقیقت کے اعتبار سے پہچاننے کی نگاہ رکھتے ہوں، وہی خدا کے رسول کو پہچانیں گے۔ ایسے ہی لوگ اس امتحان میں پورے اتریں گے کہ رسول کو مان کر اپنے آپ کو پوری طرح اس کے حوالے کر دیں۔

مردہ لوگ

دینی دعوت کا کام کرنے کے دو میدان ہیں۔ ایک ہے بنو اسرائیل جیسے لوگوں میں کام کرنا جس کا ایک نمونہ سیدنا حضرت مسیح علیہ السلام کی زندگی میں دیکھا جاسکتا ہے۔ اور دوسرا ہے بنو اسماعیل جیسے لوگوں میں کام کرنا، جس کی روشن مثال پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں نظر آتی ہے۔

بنو اسرائیل (یہود) نے حضرت مسیح کی بدترین مخالفت کی۔ انتہائی کھلے ہوئے معجزات اور انتہائی طاقتور دلائل کے باوجود انھوں نے حضرت مسیح کا اقرار نہیں کیا۔ اپنی تمام ممکن تدبیروں سے وہ حضرت مسیح کے مشن کو ناکام بنانے کی کوشش کرتے رہے۔ جب انھیں اس میں کامیابی نہیں ہوئی تو انھوں نے آخری مرحلہ میں کمینہ پن کا طریقہ اختیار کیا۔ انھوں نے حضرت مسیح پر جھوٹے الزام لگائے۔ حضرت مسیح کے الفاظ میں وہ "ابن آدم کو رومی عدالت میں لے گیے" وہ خود حضرت مسیح کو قتل نہیں کرسکتے تھے۔ چنانچہ انھوں نے یہ منصوبہ بنایا کہ آپ پر جھوٹے الزامات لگاکر رومی حکمرانوں کے ذریعہ آپ کو ہلاک کریں۔ اس معاملہ میں ظلم اور کمینہ پن کی جتنی صورتیں ان کے بس میں تھیں وہ سب انھوں نے آخری حد تک کر ڈالیں۔ تاہم اللہ تعالیٰ نے اپنی خصوصی تدبیر سے آپ کو بچالیا۔

بنو اسرائیل (یہود) اس وقت ایک انتہائی بے جان قوم بن چکے تھے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پوری قوم میں چند افراد سے زیادہ آپ کا ساتھ دینے والے نہ نکل سکے۔ پیغمبرانہ مشن کا ساتھ دینے کے لیے ضرورت ہوتی ہے کہ آدمی کے اندر اعلیٰ انسانیت زندہ ہو۔ وہ برتر مقصد کی خاطر جینے اور مرنے کا حوصلہ کرسکے۔ مگر مردہ قوم اس صلاحیت سے بالکل خالی ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بنو اسرائیل کی بھیڑ میں سے چند افراد بھی نہیں نکلے جو حضرت مسیح کے پیغمبرانہ مشن کے حامل بن سکیں۔

انجیل بتاتی ہے کہ یہود میں سے جو لوگ حضرت مسیح کا ساتھ دینے والے نکلے ان میں سے خاص لوگوں کی تعداد بارہ تھی۔ یہودیوں کی سازش کے تحت جب رومی سپاہیوں نے آپ کو پکڑنا چاہا تو انجیل کے الفاظ میں "سب شاگرد اسے چھوڑ کر بھاگ گیے" (متی، باب ۲۶) دوسری جگہ انجیل میں ہے "اس پر سب شاگرد اسے چھوڑ کر بھاگ گیے۔ مگر ایک جوان اپنے ننگے بدن پر مہین چادر اوڑھے ہوئے اس کے پیچھے ہولیا۔ اسے لوگوں نے پکڑا مگر وہ چادر چھوڑ کر ننگا بھاگ گیا" (مرقس، باب ۱۴)

یہ انسان

جدید مغربی تہذیب کی بنیاد بے قید آزادی اور لذتیت پر تھی۔ اس تہذیب کے اثرات ساری دنیا میں پھیلے۔ یہاں تک کہ امیر اور غریب، جاہل اور عالم، کوئی بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہا۔ یہ صورت حال آج اپنی انتہا کو پہونچ گئی ہے اور اس نے ساری دنیا میں انسان کو غیر انسان بنا کر رکھ دیا ہے۔ آج کے آدمی کے سامنے صرف اپنی خواہش اور اپنا فائدہ ہے۔ وہ اپنی خواہش اور اپنے فائدہ کو سب سے اعلیٰ چیز سمجھتا ہے۔ وہ اس کے حصول کے لیے سب کچھ کر سکتا ہے۔ خواہ وہ صحیح ہو یا غلط۔

تہذیب جدید کے ان اثرات کا سب سے بڑا حصہ ان ملکوں کو ملا ہے۔ جن کے مجموعہ کو برصغیر ہند کہا جاتا ہے۔ اس جغرافی خطہ کا حال یہ ہے کہ آج قوم کی قوم بے حس جانوروں کے ایک جنگل میں تبدیل ہو گئی ہے۔ ان ملکوں میں ایک سنجیدہ اور حساس آدمی کے لیے زندہ رہنا، حدیث کے الفاظ میں، کالقابض علی الجمر کا مصداق بن گیا ہے۔ یعنی ایسا جیسے اپنی مٹھی میں انگارہ لینا۔

آج ہم ایسے لوگوں کے درمیان ہیں جن کا حال یہ ہے کہ شر ان کی غذا ہے۔ بے انصافی کر کے ان کی روح کو لذت ملتی ہے۔ وہ ظالمانہ کارروائی کرتے ہیں اور اس میں کامیاب ہو کر خوشی کے قہقہے لگاتے ہیں۔ لوگ اپنی جائز کمائی کو کھا کر سیر نہیں ہوتے، وہ صرف اس وقت سیری محسوس کرتے ہیں جب کہ انھوں نے دوسروں کے اوپر ڈاکہ ڈال کر ان کے مال اور جائداد پر قبضہ کر لیا ہو۔

آج لوگوں کا حال یہ ہے کہ کسی کے بارہ میں سچی بات کا اعلان کر کے ان کی زبان تر نہیں ہوتی۔ ان کی زبان کی حلاوت صرف یہ ہے کہ وہ دوسروں کے خلاف جھوٹا پروپیگنڈا کر رہی ہو۔ دوسروں کی حیثیت کا اعتراف کر کے ان کا سینہ ٹھنڈا نہیں ہوتا۔ ان کے سینہ کی ٹھنڈک یہ ہے کہ وہ دوسرے کا اعتراف نہ کریں، وہ عزت والے کو بے عزت کریں اور جس کو خدا نے اونچا کیا ہو اس کو ذلیل کر کے اپنی روح کی تسکین حاصل کریں ——— آج کی دنیا جھوٹ پر کھڑے ہونے والوں کی دنیا ہے، آخرت کی دنیا سچ پر کھڑے ہونے والوں کی دنیا ہوگی۔ پھر اس دن وہ لوگ کہاں کھڑے ہوں گے جو صرف جھوٹ پر کھڑا ہونے والا پاؤں اپنے پاس رکھتے تھے۔

فرق کا سبب

ستمبر ۱۹۸۶ میں سی اول (کوریا) میں دسویں ایشیائی کھیل (10th Asian Games) ہوئے۔ اس ۱۶ روزہ مقابلہ میں ساؤتھ کوریا کو مجموعی طور پر سب سے زیادہ میڈل ملے۔ چند ملکوں کی تفصیل یہ ہے:

	(Gold)	(Silver)	(Bronze)	Total
China	94	82	46	222
S. Korea	93	55	76	224
Japan	58	76	77	211
Iran	6	6	10	22
India	5	9	23	37
Philippines	4	5	9	18
Thailand	3	10	13	26
Pakistan	2	3	4	9

اس نقشہ کے مطابق تین قوموں (چین، کوریا، جاپان) نے ۲۷۰ سونے کے میڈل میں سے ۲۴۵ میڈل حاصل کیے۔ ساؤتھ کوریا کے مقابلہ میں ہندستان بہت بڑا ملک ہے، مگر اوپر کے نقشہ سے ظاہر ہے کہ ہندستان اس مقابلہ میں ساؤتھ کوریا سے بہت پیچھے رہا۔ اس پر تبصرہ کرتے ہوئے نئی دہلی کے انگریزی اخبار انڈین اکسپریس (۶ اکتوبر ۱۹۸۶) نے لکھا ہے کہ کوریا والوں نے اپنے کھلاڑیوں کو چننے کے لیے ایک کمپیوٹر کا استعمال کیا اور ہر کھیل کے لوگوں کی تربیت پر ایک ایک ملین ڈالر خرچ کیے۔ یہ تربیتی عمل دو سال تک جاری رہا۔ ہندستان نے اپنا روایتی طریقہ "کوشش کرو، خواہ ہار جاؤ" اختیار کیا، جو اس کی پرانی بیماری، علاقائیت اور اقربا نوازی سے بھی پوری طرح خالی نہ تھا:

The Koreans used a computer to select their athletes and spent $ a million to train them for each discipline, for two years. India used familiar try-or-miss methods in which the old malady of parochialism and nepotism may not have been at a total discount.

دوسرے لفظوں میں یہ کہ کوریا والوں نے اپنے کھلاڑیوں کا انتخاب ان کے ذاتی جوہر کو دیکھ کر کیا۔ اور ہندستان میں کھلاڑیوں کا انتخاب زیادہ تر تعلقات کی بنیاد پر کیا گیا۔ کوریا نے بہت سے کھلاڑیوں کے بارہ میں ضروری معلومات کمپیوٹر کے اندر بھر دیں اور پھر کمپیوٹر نے مشینی غیر جانبداری کے ساتھ جو فیصلہ کیا اس کو مان لیا۔ اس کے برعکس ہندستان میں انتخاب کی بنیاد یہ تھی کہ یہ میرا رشتہ دار ہے، یہ میرے علاقہ کا آدمی ہے۔ جہاں طریقہ میں اس قسم کا فرق پایا جائے وہاں نتیجہ میں فرق پیدا ہو جانا لازمی ہے۔

الزام کافی نہیں

الزام لگانے کا نام ملزم ہونا نہیں۔ اگر کسی شخص کے واقعۃً ملزم ہونے کے لیے یہ بات کافی ہو کہ اس کے خلاف الزام لگانے والوں نے الزام لگایا ہے تو پھر دنیا کا ہر شخص ملزموں کے کٹہرے میں کھڑا ہوا نظر آئے گا، حتیٰ کہ خدا کے معصوم اور بے خطا پیغمبر بھی۔

محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم خدا کے آخری پیغمبر تھے۔ آپ بلاشبہ پاک اور معصوم تھے۔ مگر آپ کے زمانہ کے لوگوں نے آپ پر بدترین الزامات لگائے۔ یہ الزامات صرف یہودیوں اور منافقوں نے نہیں لگائے۔ بلکہ آپ کے مخلص ساتھیوں تک کو آپ کے کردار کے بارہ میں بے جا شبہات لاحق ہوئے۔ اس قسم کے واقعات میں سے ایک واقعہ وہ ہے جس کا تعلق حاطب بن ابی بلتعہ سے ہے۔ حاطب بن ابی بلتعہ ایک بدری صحابی تھے۔ یعنی وہ بدر کی جنگ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہو کر لڑے تھے۔ وہ ان لوگوں میں سے تھے جن کی دین کے لیے سرفروشی پر شبہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔

روایات میں آتا ہے کہ حاطب بن ابی بلتعہ (انصاری) اور زبیر بن العوام (مہاجر) کے درمیان ایک جھگڑا ہوا۔ یہ جھگڑا کھجور کے درختوں کی آبپاشی کے بارہ میں تھا۔ مدینہ میں پانی کا ایک گڑھا تھا جس سے آبپاشی کی جاتی تھی۔ اس کے پاس دونوں صاحبان کا کھجوروں کا باغ تھا۔ ایک بار اس امر پر جھگڑا ہو گیا کہ دونوں میں سے کون پہلے پانی لے۔ اس کا مقدمہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا۔ آپ نے یہ فیصلہ فرمایا کہ زبیر بن العوام پہلے اپنے باغ میں پانی لے جائیں اور اس کے بعد حاطب بن بلتعہ اپنے باغ کی سینچائی کریں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو فیصلہ کیا تھا وہ زرعی مصلحت اور جغرافی حالات کی بنا پر کیا تھا۔ یہ محض ایک اتفاقی بات تھی کہ زبیر بن العوام مہاجر تھے اور حاطب بن ابی بلتعہ انصاری۔ اور فیصلہ میں زبیر بن العوام کو اولیت حاصل ہو گئی۔ معاملہ کا انصاری فریق اس بات کو نہ سمجھ سکا کہ آپ نے جو فیصلہ فرمایا ہے وہ زرعی اور جغرافی بنیاد پر فرمایا ہے۔ اس نے معاملہ کو مہاجر اور انصاری کی اصطلاح میں سوچا اور یہ رائے قائم کر لی کہ آپ نے مہاجر کی جانب داری کرتے ہوئے اس کے حق

میں فیصلہ دے دیا ہے۔

چنانچہ روایات میں آتا ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں کا فیصلہ فرمایا تو اس فیصلہ کو سن کر حاطب بن ابی بلتعہ نے کہا: یارسولَ اللہ اَن کان ابن عمتك (اے خدا کے رسول کیا اسی لیے کہ وہ آپ کی پھوپھی کے لڑکے ہیں) دوسری روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ انھوں نے کہا: انما قضیٰ لہ لانہ ابن عمتہ (رسول اللہ نے ان کے حق میں اس لیے فیصلہ کیا کہ وہ ان کی پھوپھی کے لڑکے ہیں) (تفسیر ابن کثیر، الجزء الاول، صفحہ ۲۱ — ۵۲۰)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم معصوم عن الخطا تھے۔ آپ سے غلطی کا صدور نہیں ہو سکتا تھا۔ اس لیے یقینی ہے کہ یہ الزام بالکل غلط تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو فیصلہ کیا، وہ اخلاص کے تحت کیا اور عین درست کیا۔ اس کے باوجود ایک صحابی کو آپ کے بارے میں شبہ لاحق ہو گیا اور اس نے آپ کے اوپر جانب داری کا الزام لگا دیا۔

یہ واقعہ بتاتا ہے کہ الزام کے الفاظ بول دینا کسی کے ملزم ثابت ہونے کے لیے کافی نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جو آدمی بلا ثبوت کسی پر الزام لگائے اور جو لوگ محض الزام کے الفاظ سن کر متعلقہ شخص کو ملزم سمجھ لیں، وہ دونوں سخت گنہ گار ہیں۔ وہ ایسے جرم کا ارتکاب کر رہے ہیں جس کی خدا کے یہاں کوئی معافی نہیں، الا یہ کہ وہ توبہ کریں اور اللہ ان کی توبہ کو قبول کر لے۔

یہ واقعہ اور اس طرح کے دوسرے واقعات بتاتے ہیں کہ کسی کے اوپر الزام لگانے کے معاملہ میں ہم کو آخری حد تک محتاط رہنا چاہیے۔ جب معصوم پیغمبر کے بارے میں غلط فہمی کا امکان ہے تو عام انسان کے بارہ میں بدرجۂ اولیٰ غلط فہمی کا امکان ہے۔ عین ممکن ہے کہ جس چیز کو ہم ایک شخص کی خطا سمجھ رہے ہیں، وہ اس کی خطا نہ ہو بلکہ خود سمجھنے والے کی غلط فہمی ہو۔ وہ اس کی اپنی نظر کا قصور ہو نہ کہ متعلقہ شخص کی نیت یا عمل کا قصور۔

تبلیغی تحریک (انگریزی)

"تبلیغی تحریک" اس سے پہلے اردو میں شائع ہوئی تھی۔ اب اس کا انگریزی اڈیشن پریس میں ہے۔ جلد ہی انشاء اللہ چھپ کر آجائے گی۔

مینیجر

منافقت

منافقت اور یہودیت دونوں ایک ہی حقیقت کے دو نام ہیں۔ مسلم اقوام میں جس بگاڑ کو منافقت کہا گیا ہے، قدیم امتوں کے لیے اسی بگاڑ کا نام یہودیت ہے۔ منافقت یا یہودیت یہ ہے کہ آدمی زبان سے خدا اور رسول کا اقرار کرتا ہو۔ مگر خدا اور رسول کا عقیدہ اس کے دل کی گہرائیوں میں اترا ہوا نہ ہو۔ وہ آسمانی تعلیمات کو ماننے کا مدعی ہو مگر اس کی زندگی اسلامی تعلیمات کی حقیقی تعمیل سے خالی ہو۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن وحدیث میں منافق کی جو علامتیں بتائی گئی ہیں وہ سب وہی ہیں جو یہودیوں کی علامتیں بھی بتائی گئی ہیں۔ مثلاً حدیث میں منافق کی ایک علامت یہ ہے کہ جب اس کو کوئی امانت سونپی جائے تو وہ اس امانت میں خیانت کرے (اذا أؤتمن خان) ٹھیک یہی علامت یہودیت کی قرآن میں اس طرح بیان ہوئی ہے کہ یہودیوں میں ایسے لوگ بھی ہیں کہ اگر تم ان کے پاس ایک دینار بھی امانت رکھ دو تو وہ تم کو ادا نہ کریں جب تک تم ان کے سر پر کھڑے نہ ہو جاؤ (ومنهم من ان تامنه بدينار لا يؤده اليك الا ما دمت عليه قائما، آل عمران ۷۵)

یہودی وہ لوگ تھے جو خدا کی پرستاری کو چھوڑ کر دنیا کے پرستار بن گئے۔ مگر اپنی اس دنیا پرستی کے ساتھ وہ ظاہری طور پر دین کا لبادہ بھی اوڑھے ہوئے تھے۔ اسی طرح منافقت یہ ہے کہ آدمی اندر سے دنیادار ہو مگر ظاہری طور پر وہ دین دار کی صورت بنائے ہوئے ہو۔ یہودی حقیقۃً دین دار نہیں ہوتا مگر وہ مصنوعی طور پر اپنے آپ کو دیندار ظاہر کرتا ہے۔ اسی طرح منافق بھی حقیقۃً دیندار نہیں ہوتا مگر وہ مصنوعی طور پر اپنے آپ کو دین دار ظاہر کرتا ہے۔

ایسے لوگوں کے اندر جو کمزوریاں ظاہر ہوتی ہیں ان میں سے ایک خاص کمزوری یہ ہے کہ وہ دنیوی اہمیت رکھنے والی چیزوں کے معاملہ میں ناقابل اعتبار ہو جاتے ہیں۔ ان سے مالی لین دین کیا جائے، کوئی جائداد ان کے انتظام میں دی جائے، کسی باعزت عہدے پر انھیں

بٹھایا جائے، غرض یہ کہ مادی قیمت رکھنے والی کوئی چیز اگر ان کے حوالے کی جائے تو وہ ان امیدوں پر پورے نہیں اترتے جو ایسی کسی چیز کی حوالگی کے بعد شرعی یا اخلاقی طور پر ان سے کی جا سکتی ہیں۔ وہ بظاہر خوبصورت باتیں کریں گے۔ مگر ان کی باتیں اخلاص کی گہرائی سے خالی ہوں گی۔ وہ نمائشی اخلاق برتیں گے مگر ان کی زندگی میں حقیقی اخلاق کا کہیں پتہ نہ ہوگا۔

مال میں خورد برد کرنا، وعدہ پورا نہ کرنا، جائداد میں ناجائز تصرف کرنا، عہدہ کو شخصی مفاد کے لیے استعمال کرنا، یہ سب امانت میں خیانت ہے۔ اور یہ تمام خیانتیں جس طرح یہودیوں میں پائی جاتی تھیں اسی طرح وہ ان تمام نام نہاد مسلمانوں میں بھی پائی جائیں گی جن کو قرآن و حدیث میں منافق کہا گیا ہے۔ یہودیت جھوٹی دین داری کا نام ہے اور اسی طرح منافقت بھی جھوٹی دین داری کا نام۔

نفاق اور منافقین کے سلسلہ میں چند حدیثیں یہ ہیں:

عن عبد اللہ بن عمرو بن العاص ؓ ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال: اربع من کن فیہ کان منافقا خالصا ومن کانت فیہ خصلة منهن کانت فیہ خصلة من نفاق حتی یدعها۔ اذا أوتمن خان واذا حدث کذب واذا عاهد غدر واذا خاصم فجر (متفق علیہ) زاد فی روایة لمسلم: وان صام وصلی وزعم انه مسلم۔

حضرت عبد اللہ بن عمرو بن العاص سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ چار خصلتیں ایسی ہیں کہ جن کے اندر وہ ہوں وہ پورا منافق ہے۔ اور جس شخص کے اندر ان میں سے کوئی خصلت ہو تو اس کے اندر اسی کے بقدر نفاق ہوگا، یہاں تک کہ وہ اسے چھوڑ دے۔ وہ خصلتیں یہ ہیں: جب وہ امین بنایا جائے تو وہ خیانت کرے۔ اور جب بولے تو جھوٹ بولے۔ اور جب وعدہ کرے تو پھر جائے۔ اور جب بحث کرے تو جھگڑنے لگے۔ ایک روایت میں مزید ہے کہ اگرچہ وہ روزہ رکھے اور نماز پڑھے اور سمجھے کہ میں مسلم ہوں۔

عن عمر بن الخطاب ؓ عن النبی صلی اللہ

حضرت عمر بن خطاب سے روایت ہے کہ رسول اللہ

علیہ وسلم قال : انما اخاف علیٰ ھٰذہ الامۃ کل منافق یتکلم بالحکمۃ ویعمل بالجور (رواہ البیہقی)	صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ میں اس امت پر ایسے منافق سے ڈرتا ہوں جو حکمت کی باتیں کرے اور اس کا عمل ظالمانہ ہو۔
عن ابی ھریرۃ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خصلتان لاتجتمعان فی منافق۔ حسنُ سمتٍ ولا فقہ فی الدین۔	حضرت ابوھریرہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ دو خصلتیں کبھی منافق کے اندر جمع نہیں ہو سکتیں۔ خوش خلقی اور دین کا صحیح فہم۔

قرآن میں متعدد مقامات پر نفاق اور منافق کی حقیقت بتائی گئی ہے۔ ایک مقام پر ارشاد ہوا ہے کہ منافقین وہ لوگ ہیں جن کے اندر روگ ہے :

فی قلوبھم مرض فزادھم اللہ مرضًا ولھم عذاب الیم بما کانوا یکذبون (البقرہ ۔ ۱۰)	ان کے دلوں میں مرض ہے تو اللہ نے ان کے مرض کو بڑھا دیا اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے اس بنا پر کہ وہ جھوٹ کہتے تھے۔

حضرت عبدالرحمٰن بن زید بن اسلم نے کہا کہ اس سے مراد دین کا مرض ہے نہ کہ جسم کا مرض (ھذا مرض فی الدین ولیس مرضًا فی الاجساد) اس سلسلہ میں صحابہ و تابعین سے جو تفسیریں منقول ہیں، ان میں سے ایک تفسیر میں مرض کو شک کہا گیا ہے۔ اور دوسری تفسیر میں مرض کو ریا بتایا گیا ہے (تفسیر ابن کثیر، الجزء الاول، صفحہ ۷۸)

نفاق کی اصل جڑ یہی شک ہے۔ اسی سے تمام منافقانہ اوصاف پیدا ہوتے ہیں۔ منافق دکھاوے کی باتیں کرتا ہے، کیوں کہ اس بارہ میں وہ شک میں مبتلا رہتا ہے کہ خدا اس کے دل کے حال تک سے باخبر ہے۔ منافق بغض و حسد میں مبتلا ہوتا ہے، کیوں کہ اس کو یقین نہیں ہوتا کہ جو کچھ کسی کو ملا ہے وہ اللہ کے دیئے سے ملا ہے، منافق برے اعمال کرتا ہے، کیوں کہ وہ اس یقین سے خالی ہوتا ہے کہ مرنے کے بعد وہ اللہ کے یہاں پکڑا جائے گا۔ منافق جھوٹی کارروائیاں کرتا ہے، کیوں کہ خدا کے بارہ میں بے یقینی میں مبتلا ہونے کی وجہ سے اس کو ڈر نہیں ہوتا کہ ایک روز اس کے جھوٹ کا پردہ کھلے گا اور وہ ہمیشہ کے لیے بے عزت ہو کر رہ جائے گا۔

ایک تقاضا

مولانا شبلی نعمانی (۱۹۱۴- ۱۸۵۷) نے جدید اسلامی تعلیم کی تحریک اٹھائی۔ انھوں نے اس زور و شور کے ساتھ اس کی آواز بلند کی کہ ہر طرف اس کا چرچا شروع ہو گیا۔ اس وقت جدت پسند طبقہ نے یہ اعتراض کیا کہ اسلامی تعلیم مسلم نوجوانوں کو پیچھے لے جائے گی۔ کیوں کہ اسلام علم کا مخالف ہے۔ اس کی مثال یہ دی گئی کہ خلیفہ ثانی حضرت عمر فاروق کے زمانہ میں اسکندریہ (مصر) فتح ہوا۔ اس وقت وہاں ایک بہت بڑا یونانی کتب خانہ تھا جو بطلیموس کے زمانہ سے چلا آرہا تھا۔ مگر یہ مسلمان علم کے اتنے ناقدر شناس تھے کہ انھوں نے اس کتب خانہ کو جلا کر خاک کر دیا۔ دنیا گزشتہ انسانی دماغوں کے ورثہ سے محروم ہو گئی۔

اس وقت مولانا شبلی نے اس مسئلہ کی زبردست تحقیق شروع کی اور پھر اس موضوع پر ایک محققانہ مقالہ شائع کیا۔ اس مقالہ میں انھوں نے تاریخی حوالوں سے ثابت کیا کہ مذکورہ کتب خانہ اسلامی فتح سے بہت پہلے برباد ہو چکا تھا۔ حضرت عمر فاروق کے زمانہ میں اس کا کوئی نشان تک باقی نہیں رہ گیا تھا۔ مولانا شبلی نے تاریخی حقائق کے ذریعہ ثابت کیا کہ اسکندریہ کا کتب خانہ عیسائیوں نے اپنے زمانہ میں برباد کیا تھا۔ بعد کو چھٹی صدی ہجری کے ایک عیسائی مورخ ابوالفرج ملطی نے یہ کیا کہ عیسائیوں کو اس الزام سے بچانے کے لیے اس واقعہ کو غلط طور پر مسلمانوں کی طرف منسوب کر دیا۔ مولانا شبلی کی یہ بات اتنی مدلل تھی کہ بعد کو خود یورپی محققین نے اس کی تائید کی۔

اس مثال سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مولانا شبلی نے جو مہم اٹھائی وہ پوری طرح اس کے اہل (Competent) تھے۔ انھوں نے جس طرح جدید اسلامی تعلیم کا غلغلہ بلند کیا اسی طرح وقت کی طرف سے پیش آنے والے سوالات کا اعلیٰ ترین علمی اور عقلی سطح پر جواب بھی دیا۔ اس کے برعکس مثال ان لوگوں کی ہے جو موجودہ زمانہ میں "تحفظ شریعت" کی تحریک لے کر اٹھے۔ یہ لوگ اپنے آپ کو اس عظیم تحریک کا اہل ثابت نہ کر سکے۔ انھوں نے مداخلت فی الدین کا نعرہ تو بہت لگایا۔ مگر اس جدید ذہنی تقاضہ کو پورا نہ کر سکے کہ

اسلامی قانون کو اعلیٰ علمی سطح پر مدلل کر کے پیش کر دیں۔

۸۶ - ۱۹۸۵ ہندستانی مسلمانوں کے لیے اسلامی شریعت کا سال تھا۔ محمد احمد۔ شاہ بانو کیس میں سپریم کورٹ نے یہ فیصلہ دیا کہ محمد احمد اپنی مطلقہ بیوی کو ماہانہ ۱۸۰ روپیہ گذارہ ادا کریں۔ یہ فیصلہ اسلامی شریعت کے خلاف تھا۔ چنانچہ ہندستانی مسلمانوں کا مذہبی طبقہ اس کے خلاف اٹھ کھڑا ہوا۔ ہر طرف مداخلت فی الدین کے نعرے لگنے لگے۔ جلسہ اور جلوس کی سیاست نے اتنا ترقی کی کہ لوگوں کے خیال کے مطابق خلافت تحریک کے بعد اس قسم کی مثال نہیں دیکھی گئی۔ بالآخر ہندستانی مسلمانوں کو فتح حاصل ہوئی۔ مئی ۱۹۸۶ میں مطلقہ مسلم خواتین کے بارے میں ہندستانی پارلیمنٹ نے ایک قانون پاس کر دیا۔

مگر یہ فتح اپنے ساتھ ایک عظیم شکست بھی لے آئی ہے۔ مسلمانوں نے اپنی پرشور تحریک تمام تر صرف مداخلت فی الدین اور تحفظ شریعت کے نام پر چلائی۔ ان کے اصاغر و اکابر میں سے کوئی بھی شخص یہ کام نہ کر سکا کہ مضبوط دلائل کے ساتھ یہ ثابت کرتا کہ اسلام کا قانون ہی درست اور مفید قانون ہے۔ آج کا انسان ہر چیز کو عقل پر پرکھتا ہے۔ اب چوں کہ مسلمان اعلیٰ عقلی معیار پر شرعی قانون کو مدلل نہ کر سکے اس لیے ظاہری فتح کے باوجود ایسا نہ ہو سکا کہ لوگوں کے ذہن پر اسلامی قانون کی عظمت قائم ہوتی۔

مسلمانوں کی ہنگامہ خیز تحریک کا یہ نتیجہ ہوا کہ اسلام کا نکاح و طلاق کا قانون سارے ملک میں زیر بحث آ گیا۔ ہر اخبار و رسالہ اس کے بارے میں اظہار خیال کرنے لگا۔ ہر جگہ اس پر بحث ہونے لگی۔ اب ایک طرف ہمارے علماء تھے جو اصرار کر رہے تھے کہ شریعت کے مطابق مطلقہ عورت کو نفقہ نہیں دیا جا سکتا۔ دوسری طرف مسلمانوں کا جدید طبقہ اور غیر مسلم حضرات تھے جو ہندستان کے کریمنل پروسیجر کوڈ کی دفعہ ۱۲۵ کی حمایت کر رہے تھے جس کے مطابق مطلقہ عورت کو یہ حق دیا گیا ہے کہ وہ اپنے سابق شوہر سے ۵۰۰ روپیہ سالانہ کی حد تک گزارہ وصول کر سکتی ہے۔

اسلام کا قانون بلاشبہ انتہائی معقول اور بہتر قانون ہے۔ مگر ہمارے علماء اس کی معقولیت کو جدید دلائل کے ساتھ ثابت شدہ نہ بنا سکے۔ وہ صرف مداخلت فی الدین کے نام پر

وگوں کی بھیڑ جمع کرتے رہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بظاہر دیکھنے والوں کو اسلام کا قانون کم تر اور جدید قانون برتر نظر آیا۔ اسلام کا قانون، علماء کی نمائندگی کے مطابق، بس یہ تھا کہ ایک مرد جب چاہے اپنی عورت کو طلاق دے کر اپنے گھر سے رخصت کر دے اور اس کے بعد اس کے اخراجات کی کوئی ذمہ داری مرد کے اوپر نہ رہے۔ دوسری طرف جدید قانون کی تصویر ان کے سامنے یہ آئی کہ وہ طلاق کے بعد بھی عورت کو سہارا دیتا ہے۔ وہ شوہر کی زیادتی کی تلافی اس صورت میں کرتا ہے کہ اس کو قانونی طور پر پابند کرتا ہے کہ وہ اپنی مطلقہ بیوی کو ماہانہ گزارہ ادا کرے۔ ہمارے علماء نے جو کچھ کیا، اپنی نیت کے اعتبار سے تحفظ شریعت کے لیے کیا، مگر عملاً وہ اسلام کو کم تر (Degrade) کرنے کے ہم معنی بن گیا۔

اس میں یہ سبق ہے کہ آدمی کو ہمیشہ ایسے کام کو لے کر اٹھنا چاہیے جس کے لیے وہ واقعۃً اہل (Competent) ہو۔ اگر وہ پیش نظر مہم کو سنبھالنے کی اہلیت نہ رکھتا ہو تو اس کا چپ رہنا اس سے بہتر ہے کہ وہ اقدام کرے۔ کیوں کہ وہ اقدام کر کے بات کو اور بگاڑ دے گا، وہ اس کو بنانے کا سبب نہیں ہو سکتا۔

۱۷ مئی ۱۹۸۶ کا واقعہ ہے۔ اس دن نئی دہلی کے انڈیا انٹرنیشنل سنٹر میں ایک اجتماع (Dialogue) تھا۔ اس موقع پر راجدھانی کے اعلیٰ تعلیم یافتہ مسلمان اور ہندو بلائے گیے۔ پروگرام کے مطابق ایک مشہور مسلمان قائد نے مفصل تقریر کی۔ انھوں نے اپنی تقریر میں کہا کہ شریعت ہم کو جان سے بھی زیادہ عزیز ہے۔ ہم کسی قیمت پر شریعت کے اندر مداخلت کو برداشت نہیں کر سکتے۔ قرآن کے مطابق مطلقہ عورت کے لیے نفقہ نہیں ہے۔ اس لیے ہم کسی مسلمان عورت کو یہ اجازت دینے کے لیے تیار نہیں ہیں کہ وہ ملکی عدالت میں جائے اور وہاں سے ملکی قانون کے مطابق اپنے سابق شوہر سے نفقہ وصول کرنے کا حکم حاصل کرے۔

قائد موصوف نے اس موضوع پر کافی پرجوش تقریر کی مگر وہ یہ نہ کر سکے کہ شریعت کے اصول کو عقلی طور پر اس طرح مدلل کریں کہ لوگ اس کی برتری ماننے پر مجبور ہو جائیں۔ چنانچہ جب انھوں نے تقریر ختم کی تو ایک ہندو بزرگ نے کہا کہ موجودہ زمانہ میں اس قسم کی باتیں قبول نہیں کی جا سکتیں۔ آپ کو اپنے قانون کی معقولیت بتانی ہوگی۔ صرف ادعا ہرگز کافی نہیں۔ کل

اگر آپ یہ کہیں کہ ہماری شریعت میں لکھا ہوا ہے کہ بہو پر تیل چھڑک کر اس کو جلا دو تو کیا آپ کو اپنی بہو کو جلانے دیا جائے گا۔ اور ملکی قانون اس میں مداخلت نہیں کرے گا۔

ہندو مقرر نے سب کے سامنے علی الاعلان یہ بات کہی۔ مگر قائد موصوف اس کی تردید میں کوئی مدلل بات پیش نہ کر سکے۔

ہمیں یہ جاننا چاہیے کہ موجودہ زمانہ تعقل کا زمانہ ہے۔ موجودہ زمانہ کا انسان ہر بات کو عقل پر جانچتا ہے اور اس کو اسی وقت قبول کرتا ہے جب کہ وہ عقلی معیار پر پوری اترے۔ ایسی حالت میں اگر ہم کسی اسلامی اشو کو عوامی سطح پر اٹھائیں اور اس کے عنوان پر ہنگامہ خیز سیاست چلائیں تو ہمیں پیشگی طور پر یہ جاننا چاہیے کہ آج کل کا انسان اس کے حق میں عقلی دلیل مانگے گا۔ وہ اس کو قابل لحاظ ماننے کے لیے یہ مطالبہ کرے گا کہ اس کو معقول اور مدلل بنا کر پیش کرو۔ اگر ہم ایسا نہ کر سکیں تو ہم جدید انسان کی نظر میں اسلام کو کمتر اور حقیر بنا کر رکھ دیں گے خواہ بطور خود ہم یہی سمجھتے رہیں کہ ہم نے اسلام کا جھنڈا پارلیمنٹ کی دیواروں پر گاڑ دیا ہے۔

پانی پت کے قریب ایک گاؤں میں ۲۸ دن کا ایک بچہ چرا لیا گیا اور اس کو "دیوی جی" کے نام پر قربان کر دیا گیا۔ قربانی کرنے والوں کا عقیدہ تھا کہ اس طرح ان کی مراد پوری ہو جائے گی۔ (ٹائمس آف انڈیا ۹ ستمبر ۱۹۸۶) اس طرح کے واقعات اخباروں میں برابر آتے رہتے ہیں۔ اسی طرح افریقہ کے بعض قبائل اپنے توہماتی عقیدہ کے تحت اپنی عورتوں کے چہرے گرم لوہے سے داغتے ہیں۔ اس کے نتیجہ میں ساری عمر کے لیے ان کے چہرے بگڑ جاتے ہیں۔ اس قسم کے لوگ اگر اپنے رواجوں کو قانون کی صورت دینے کے لیے ہنگامے کریں اور ووٹ پسند حکمراں ان کے حق میں قانون بھی بنا دیں تب بھی ایسا نہیں ہو سکتا کہ آج کی دنیا میں ان کو باعزت مقام حاصل ہو جائے۔ اسلام کا قانون بلاشبہ معقول ترین قانون ہے۔ مگر موجودہ زمانہ میں اس کی معقولیت پر پردہ پڑ گیا ہے۔ آج اصل ضرورت یہ ہے کہ ان پردوں کو ہٹا کر اسلام کی تعلیمات کی معقولیت کو دوبارہ نمایاں کیا جائے۔ جس دن اسلام کو یہ فکری عظمت حاصل ہو گی، بقیہ تمام عظمتیں اپنے آپ اس کو حاصل ہو جائیں گی۔

ایک سفر

ایک پروگرام کے تحت بھوپال کا سفر ہوا۔ بھوپال ہندستان کا ایک قدیم شہر ہے جو دہلی سے سات سو کیلومیٹر کے فاصلہ پر واقع ہے۔ موجودہ سفر کو ملا کر یہاں کے لیے اب تک میرے چار سفر ہو چکے ہیں۔ تفصیل یہ ہے :

پہلا سفر	جنوری ۱۹۸۱
دوسرا سفر	اپریل ۱۹۸۲
تیسرا سفر	نومبر ۱۹۸۳
چوتھا سفر	اپریل ۱۹۸۶

۱۸ اپریل ۱۹۸۶ کی شب کو تامل ناڈو اکسپریس کے ذریعہ روانگی ہوئی۔ دہلی سے بھوپال کے لیے یہ سب سے کم وقت کی ٹرین ہے۔ تاہم مشینی سواریوں سے مجھے اتنی وحشت ہوتی ہے کہ ہوائی جہاز کا سفر بھی مجھ کو دیر طلب معلوم ہوتا ہے۔ اپنے اس مزاج کی وجہ سے ریل مجھ کو لوہے اور لکڑی کا ایک دوڑتا ہوا قید خانہ نظر آتی ہے، ایک ایسا قید خانہ جس میں داخل ہونا اپنے بس میں ہو اور اس سے نکلنا صرف دوسرے کے بس میں۔

ہندستان (بمبئی) میں ریلوے کا آغاز ۱۸۵۳ میں ہوا۔ ہندستان کے ریلوے سسٹم کی مجموعی لمبائی ۳۷ ہزار میل سے کچھ زیادہ ہے۔ وہ دنیا کا چوتھا سب سے بڑا نظام ہے۔ بقیہ تین ممالک ـــــ امریکہ اور روس اور کناڈا ہیں۔ ہندستانی ریلوے میں چودہ لاکھ سے زیادہ آدمی ملازم ہیں۔ اس کے پاس تقریباً بارہ ہزار انجن اور دس ہزار ٹرینیں ہیں۔ یہ ٹرینیں روزانہ تقریباً ساٹھ لاکھ مسافر ادھر سے ادھر لے جاتی ہیں۔ اور روزانہ پانچ لاکھ ٹن سے زیادہ سامان ایک مقام سے دوسرے مقام تک پہونچاتی ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ ریلوے کی تاریخ سولھویں صدی عیسوی کے وسط تک جاتی ہے۔ اس وقت جرمنی کی بعض کوئلہ کی کانوں میں ابتدائی ریل چلائی گئی جس کو گھوڑے کھینچتے تھے اور وہ لکڑی کی پٹری پر چلتی تھی۔ اسٹیم سے چلنے والا پہلا انجن ۱۸۰۳ میں انگلینڈ میں بنایا گیا۔ تاہم ریلوے کا دور

حقیقی معنوں میں ۱۵ ستمبر ۱۸۳۰ کو شروع ہوا جب کہ لوگوں نے پہلی بار ایک باقاعدہ ٹرین کا منظر دیکھا جو لیورپول اور مانچسٹر کے درمیان سیٹی بجاتی ہوئی دوڑ رہی تھی اور اس کا انجن سامان اور مسافر کو لیے ہوئے لوہے کی پٹری پر چلا جا رہا تھا۔

پچھلے ڈیڑھ سو سال میں ریلوے میں غیر معمولی ترقی ہوئی ہے۔ جاپان میں گولی ٹرین (Bullet train) ایجاد ہو چکی ہے۔ فرانس میں ایسی ٹرین بنائی گئی ہے جو ۷۰۰ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے چلتی ہے۔ اس کے پہیے ریل کی پٹری پر نہیں چلتے بلکہ ہوا کے گدے (Cushion of air) پر چلتے ہیں۔ یہ ہوائی گدا تقریباً ایک انچ موٹا ہوتا ہے۔ جو ریل کی رفتار کے دوران اس کے پہیے اور ریل کی پٹری کے درمیان بنتا ہے۔

۱۹ اپریل کی صبح کو سو کر اٹھا تو ہماری گاڑی مدھیہ پردیش کے میدانوں میں دوڑ رہی تھی۔ جگہ جگہ درخت اور سبزہ کا منظر تھا۔ صبح کا سورج بلند ہو کر پوری فضا کو روشن کر رہا تھا۔ اس قسم کی ایک دنیا کا وجود میں آنا تمام عجائبات میں سب سے بڑا عجوبہ ہے۔ ایک ایسی دنیا جہاں پانی اور سبزہ ہو۔ جہاں سورج ایک خاص تناسب سے روشنی اور حرارت پہونچائے۔ جہاں وہ بے شمار اسباب جمع ہوں جس نے اس بات کو ممکن بنایا کہ ایک ٹرین بن کر تیار ہو اور وہ اس کی سطح پر تیز رفتاری کے ساتھ دوڑے۔ ایسی دنیا اپنے پورے وجود کے ساتھ خدا کا تعارف ہے۔ وہ اپنے خالق کا اعلان کر رہی ہے۔

بنانے والے نے اس دنیا کو عجیب ڈھنگ سے بنایا ہے۔ یہاں واقعہ دکھائی دیتا ہے مگر صاحب واقعہ نظر نہیں آتا۔ یہاں تخلیق کا منظر ہر طرف پھیلا ہوا ہے مگر ان کے درمیان خالق بظاہر کہیں موجود نہیں۔ اس صورت حال نے بہت سے لوگوں کو خدا کا منکر بنا دیا۔ وہ کہتے ہیں کہ جب ہم خدا کو دیکھتے نہیں تو ہم کیسے اسے مانیں۔ مگر خدا کے انکار کے لیے یہ بنیاد کافی نہیں۔

ہم جس ٹرین میں سفر کر رہے ہیں وہ ایک بہت بڑی ٹرین ہے۔ وہ ۱۱۰ کیلومیٹر فی گھنٹہ کی رفتار سے مسلسل دوڑ رہی ہے۔ ہم اس کے اندر بیٹھے ہوئے منزل کی طرف چلے جا رہے ہیں۔ بظاہر ہم ریل کے ڈرائیور کو نہیں دیکھتے۔ اس کا نام بھی ہم کو نہیں معلوم۔ مگر ہمیں یقین ہے کہ گاڑی کا ایک ڈرائیور ہے اور وہی اس کو چلا رہا ہے۔

ہم کو یہ یقین کیوں ہے۔ منکر خدا کہیں گے، اس لیے کہ اگرچہ ہم ڈرائیور کو نہیں دیکھتے مگر ہم

کو دیکھ سکتے ہیں۔ ہمارے لیے یہ ممکن ہے کہ کسی بھی اسٹیشن پر اتر کر انجن کے پاس جائیں اور وہاں اس کو دیکھیں۔ لیکن یہ محض ایک مغالطہ ہے۔ اگر ہم اسٹیشن پر اتر کر انجن کے پاس جائیں اور گاڑی کے ڈرائیور کو دیکھیں تو ہم کیا چیز دیکھیں گے۔ ہم صرف ہاتھ پاؤں والے ایک جسم کو دیکھیں گے۔ مگر کیا یہی دکھائی دینے والا جسم ہے جو گاڑی کو چلا رہا ہے۔ یقیناً نہیں۔ انجن کو چلانے والا دراصل ذہن ہے نہ کہ ظاہری جسم۔ چنانچہ موت کے بعد ڈرائیور کا جسم پوری طرح موجود رہتا ہے مگر وہ گاڑی کو چلا نہیں پاتا۔ حقیقت یہ ہے کہ یہاں بھی وہی صورت حال ہے ـــــ ہم گاڑی کا ایک ڈرائیور مان رہے ہیں، بغیر اس کے کہ ہم نے ڈرائیور کو واقعی طور پر دیکھا ہو۔

موجودہ زمانہ کے منکرین خدا کہتے ہیں کہ یہ دنیا محض اتفاق سے بن گئی ہے۔ اس کا کوئی موجد اور خالق نہیں۔ مگر موجودہ کائنات جیسی بامعنی کائنات کا محض اتفاق سے ظہور میں آنا ممکن نہیں۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے کسی کباڑخانہ میں دھماکہ ہونے سے ایک ایکسپریس ٹرین برآمد ہو جائے یا اچانک ایک ہوائی جہاز بن کر ہوا میں اڑنے لگے۔

میرے ساتھ ثانی اثنین خاں بھی بھوپال گیے تھے۔ انھوں نے اپنا ٹکٹ عین روانگی کے دن ۱۸ اپریل کو لیا۔ جب کہ میرا ٹکٹ روانگی سے دو ہفتہ پہلے لیا گیا تھا۔ بظاہر دونوں کو الگ الگ ڈبہ میں ہونا چاہیے تھا۔ مگر اسٹیشن پہونچ کر رزرویشن چارٹ دیکھا گیا تو معلوم ہوا کہ دونوں کی برتھ ایک ہی بوگی کی ایک ہی کیبن میں ہے۔ بظاہر یہ خلاف امید تھا۔ یہ جو ہوا، ہماری کسی کوشش کے بغیر محض اتفاق سے ہوا۔

اس قسم کے اتفاقی واقعات ہماری دنیا میں پیش آتے رہتے ہیں۔ انھیں جزئی مثالوں کو لے کر موجودہ زمانہ کے منکرین یہ کہتے ہیں کہ یہ پورا عالم محض اتفاق سے بن گیا ہے۔ مگر یہ سراسر بے بنیاد قیاس ہے۔ اتفاق کی بنا پر کبھی ایسا تو ہو سکتا ہے کہ دو مسافر کسی ٹرین کے لیے الگ الگ رزرویشن کرائیں اور دونوں کو اتفاق کی بنا پر ایک ہی ڈبہ میں نیچے اوپر جگہ مل جائے۔ مگر یہ ناممکن ہے کہ ایک پوری بھری ہوئی ٹرین اور اس کا پورا انظام محض اتفاق کے تحت وجود میں آجائے۔ پہلا واقعہ بلاشبہ ممکن ہے اور دوسرا واقعہ بلاشبہ ناممکن۔

۱۹ اپریل ۱۹۸۶ کی صبح کو بھوپال پہونچا۔ یہاں میرا قیام جناب حافظ وحید الدین صاحب کے

مکان پر تھا۔ موصوف نہایت دیندار آدمی ہیں اور قدیم مشرقی وضع کا نمونہ ہیں۔

بھوپال کی ریاست ۱۷۲۳ء میں قائم ہوئی۔ وہ حیدرآباد کے بعد ہندستان کی دوسری سب سے بڑی مسلم ریاست تھی۔ اس کے پہلے فرماں روا سردار دوست محمد خاں (۱۱۵۰ - ۱۱۲۰ھ) تھے۔ اور آخری فرماں روا نواب حمید اللہ خاں (۱۹۴۹ - ۱۹۲۴ء) تھے۔ اس دوران ریاست بھوپال سے جو واقعات وابستہ ہیں ان میں سے ایک خاص واقعہ نواب صدیق حسن خاں صاحب (۱۸۹۰ - ۱۸۳۲ء) کا ہے۔ وہ قنوج میں پیدا ہوئے۔ عربی و فارسی کی تعلیم حاصل کی۔ معاشی مسئلہ سے مجبور ہو کر وہ نوجوانی کی عمر میں اپنے وطن سے نکلے۔ مختلف نشیب و فراز کے بعد بالآخر وہ بھوپال پہونچے۔ یہاں ۱۸۵۹ء میں تاریخ نگاری کے کام پر ان کا تقرر ہوا اور ۷۵ روپیہ مشاہرہ مقرر ہوا۔

صدیق حسن صاحب نہایت ذہین آدمی تھے۔ اسی کے ساتھ وہ جسمانی اعتبار سے ایک پرکشش شخصیت رکھتے تھے، چنانچہ بھوپال کی خاتون نواب شاہ جہاں بیگم کو ان سے دل چسپی ہوئی۔ ابتداءً ان کو ریاست میں ایک بڑے عہدے (میر دبیری) پر فائز کیا گیا۔ اس کے بعد حکومت برطانیہ کی اجازت سے ۱۸۷۰ میں ان کا عقد والیہ ریاست کے ساتھ ہو گیا۔ ان کو امیر الملک والاجاہ کا خطاب ملا اور وہ نواب صدیق حسن خاں کہے جانے لگے۔ دھیرے دھیرے بھوپال کے ریاستی اختیارات بھی عملاً ان کے قبضہ میں آ گیے۔

نواب صدیق حسن صاحب کے زمانہ میں بھوپال میں بہت سی دینی اصلاحات ہوئیں۔ ان کے لیے یہاں کام کے زبردست مواقع تھے۔ مگر موصوف کے سیاسی ذہن کی وجہ سے یہ موقع بہت زیادہ دیر تک باقی نہ رہا۔ ان کے سیاسی مزاج نے ان کو انگریزوں کی نظر میں معتوب بنا دیا۔ ۱۸۸۵ء میں وہ نوابی سے معزول کر دیے گیے۔ بقیہ عمر انھوں نے خانہ قید ہو کر گزاری۔

یہاں کے ایک صنعت کار جناب سلیم شمسی صاحب نے ہم کو بھوپال کی سیر کرائی۔ اس سے اندازہ ہوا کہ دوسرے اکثر بڑے شہروں کی طرح بھوپال بھی دو بھوپال کا نام ہے۔ بھوپال قدیم اور بھوپال جدید۔ قدیم بھوپال تنگ سڑکوں، گھنی آبادیوں اور گندی نالیوں کا نام ہے۔ اس کے برعکس جدید بھوپال میں کشادہ سڑکیں ہیں۔ کھلے ہوئے مکانات ہیں۔ ہر طرف صفائی ستھرائی کا ماحول ہے۔ قدیم بھوپال میں مسلمانوں کی تعداد ۳۰ فی صد ہے۔ اور جدید بھوپال میں بمشکل ۵ فی صد۔ یہ واقعہ علامتی طور پر مسلمانوں

کی حالت کو بتا رہا ہے ـــــ مسلمان ماضی کی دنیا میں " زیادہ " تھے مگر حال کی دنیا میں وہ " کم " ہو کر رہ گیے۔

بھوپال آزادی کے بعد کے ہندستان میں گم نامی کی تاریکی میں جا چکا تھا۔ اس کو دوبارہ شہرت صرف ۱۹۸۴ میں ہوئی اور وہ بھی ایک بربادی کے واقعہ کے ذریعہ۔ ۳ دسمبر ۱۹۸۴ کو یہاں یونین کاربائڈ کمپنی کے پیسٹی سائڈ پلانٹ میں حادثہ ہوا۔ ایک ٹینک جس میں ۴۰ ٹن مہلک گیس بھری ہوئی تھی، اس میں شگاف ہو گیا۔ گیس کہر اور دھوئیں کی شکل میں باہر آنے لگی۔ ایک گھنٹہ کے اندر اس کی چالیس ٹن گیس باہر آ گئی۔ ۲۰ مربع کیلومیٹر کے رقبہ میں ہر سانس لینے والا اس سے متاثر ہوا۔ تقریباً ڈھائی ہزار (عوامی رائے کے مطابق اس سے بہت زیادہ) آدمی مر گیے۔ تقریباً تین لاکھ آدمی پر اس نے اثر ڈالا۔

اس حادثہ کی تلافی (Compensation) کا کیس امریکہ کی عدالت میں چل رہا تھا۔ ہندستان کی حکومت نے بھوپال کے شہریوں کی طرف سے مطالبہ کیا تھا کہ یونین کاربائڈ کمپنی ایک بلین ڈالر (۱۲۰۰ کرور روپیہ) ادا کرے۔ مگر ۱۲ مئی ۱۹۸۶ کے فیصلہ میں امریکی جج نے زر تلافی کی ادائگی سے انکار کر دیا۔

بھوپال کے کچھ لوگوں نے بتایا کہ زیادہ تر واقعات گھبراہٹ میں ہوئے۔ جب مہلک گیس فضا میں پھیلی تو لوگ گھبرا کر باہر بھاگے۔ باہر بھاگنے میں ایک تو وہ پوری طرح گیس کی زد میں آ گیے۔ دوسرے دوڑنے بھاگنے کی وجہ سے ان کی سانس تیز ہو گئی اور نتیجۃً گیس زیادہ مقدار میں ان کے اندر جانے لگی۔ اس کے برعکس جو لوگ کسی وجہ سے بھاگ نہ سکے اور دروازے اور کھڑکی بند کر کے گھر کے اندر رکے رہے وہ نسبتاً گیس کے مہلک اثرات سے محفوظ رہے ـــــ آدمی ہمیشہ " اقدام " کی بات سوچتا ہے۔ حالانکہ اکثر حالات میں اقدام یہ ہوتا ہے کہ سرے سے کوئی اقدام نہ کیا جائے۔

مسٹر جیکسن براؤننگ (Jackson Browning) امریکہ کی مذکورہ یونین کاربائڈ کمپنی کے ہیلتھ ڈائرکٹر ہیں۔ انھوں نے ایک بیان میں کہا کہ ہماری کمپنی نے اس قسم کے دو پلانٹ لگائے ہیں ایک امریکہ میں اور دوسرا ہندستان میں۔ امریکہ کے پلانٹ میں کمپیوٹر حفاظتی نظام (Computerised safety system) لگا ہوا ہے۔ یہ سسٹم نہایت حساس ہوتا ہے اور اس قسم کی کسی خرابی کو پیشگی طور پر معلوم کر کے اس کی اصلاح کر دیتا ہے۔ اس قسم کا کمپیوٹر سسٹم ہندستان کے پلانٹ میں بھی لگنا چاہیے تھا۔ مگر وہ لگایا نہ جا سکا، جس کے نتیجہ میں اتنا بڑا حادثہ پیش آیا۔ اس کی وجہ ان کے نزدیک ہندستان میں اس کی پشت پناہی کرنے والے نظامات کا نہ ہونا اور فالتو پرزے کی ناکافی فراہمی ہے

(ہندستان ٹائمس ۸ دسمبر ۱۹۸۴) :

He said there were insufficient back-up systems and spare parts in India.

گیس کے حادثہ کو اب دو سال بیت چکے ہیں۔ مگر ڈاکٹروں کی ایک ریسرچ ٹیم نے اندازہ لگایا ہے کہ اب بھی بھوپال میں تقریباً ۳۰ ہزار آدمی ایسے ہیں جو زہریلی گیس کے مابعد اثرات (After-effects) کا شکار ہیں (انڈین اکسپریس ۶ مئی ۱۹۸۶)

بھوپال میں قدیم دور کی ایک یادگار تاج المساجد ہے جو غالباً ہندستان کی سب سے بڑی مسجد ہے۔ یہ مسجد خاتون نواب شاہ جہاں بیگم نے ۱۸۸۶ میں بنوانا شروع کیا۔ ۱۹۰۱ میں ان کے انتقال کی وجہ سے کام رک گیا۔ اس کی بنیادی تعمیر ہو چکی تھی۔ تاہم اس کی تکمیل سے پہلے ان کا انتقال ہو گیا۔ ان کے بعد ان کی صاحبزادی سلطان جہاں بیگم ریاست کی تاجدار مقرر ہوئیں۔ مگر ماں بیٹی میں اتنا زیادہ بگاڑ تھا کہ سلطان جہاں بیگم جب اقتدار میں آئیں تو انھوں نے مسجد کی مزید تعمیر کا کام روک دیا۔ حتی کہ مجھے معلوم ہوا کہ شاہ جہاں بیگم کے زمانہ میں جو اینٹیں تیار کی گئی تھیں ان پر ان کے نام کی نسبت سے 'شش' لکھا گیا تھا۔ سلطان جہاں بیگم کے زمانہ میں اینٹوں پر 'شش' کا نقطہ منصوبہ کے تحت مٹایا گیا تاکہ 'شش' کا حرف 'س' کا حرف بن جائے جو سلطان جہاں بیگم سے مشابہت رکھتا ہے (ماں اور بیٹی کے درمیان اس بگاڑ کی وجہ غالباً صدیق حسن خاں صاحب سے نکاح تھا)

اس نامکمل مسجد کو مکمل کرانے کا کام آزادی کے بعد مولانا محمد عمران خاں صاحب نے اپنی تولیت میں لیا اور مولانا سید سلیمان ندوی کے مشورہ پر اس میں عربی مدرسہ کی بنیاد ڈالی۔ نوابی دور میں عربی کا مدرسہ احمدیہ تھا۔ وہ سرکاری خرچ پر چلتا تھا۔ مسلم ریاست ختم ہونے کے بعد وہ ختم ہو گیا۔ اس خلا کو اس مدرسہ نے پُر کیا جسے مولانا عمران خاں صاحب نے قائم کیا تھا۔ پھر ۱۹۷۱ء میں مولانا محمد عمران خاں صاحب نے شاہ محمد یعقوب صاحب مجددی کے مشورہ پر تاج المساجد کی تکمیل کا آغاز کیا۔ دار العلوم تاج المساجد کے استاد ڈاکٹر حمید اللہ ندوی نے بتایا کہ شاہ محمد یعقوب صاحب مجددی نے حکمت کی ایک بات مولانا کو یہ بتائی کہ بھوپال کے باہر سے کسی طرح کچھ پیسہ لا کر ایک بار کام شروع کر دیجئے۔ بھوپال والے جب کام ہوتا ہوا دیکھیں گے تو پیسہ دینا شروع کر دیں گے۔ اور عملاً ایسا ہی ہوا۔ تاج المساجد کی تکمیل کی فنی

نگرانی مدھیہ پردیش کے مشہور آرکیٹکٹ جناب سرور قریشی صاحب نے کی اور عملی نگرانی سخت محنت و لگن سے مولانا عمران خاں صاحب کے بھائی مولانا محمد سلمان صاحب نے کی۔

مولانا محمد عمران خاں صاحب ندوی (۵۷ سال) بھوپال کی خاص شخصیت ہیں۔ اس سے پہلے وہ ندوہ (لکھنؤ) میں مہتمم تھے۔ عجیب بات ہے کہ وہ ندوہ میں جس کمرہ میں رہا کرتے تھے، اسی کمرہ میں میں بھی اپنے قیام ندوہ کے زمانہ میں مقیم رہا۔ مولانا محمد عمران خاں سے اس سفر میں دوبار ملاقات ہوئی۔ ایک بار موصوف کی رہائش گاہ پر اور دوسری بار اس وقت جب کہ مولانا موصوف باز دید کے لیے میری قیام گاہ پر تشریف لائے۔ مولانا میری بعض کتابیں مثلاً "پیغمبر انقلاب" پڑھ چکے ہیں اور اس سے اتفاق فرماتے ہیں۔

موجودہ تاج المساجد مولانا عمران خاں صاحب ہی کا کارنامہ ہے۔ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا (۱۹۸۴) میں بھوپال کے تذکرہ کے ذیل میں وہاں کی سب سے نمایاں عمارت کے طور پر جو تصویر شائع کی گئی ہے وہ تاج المساجد کی تصویر ہے۔ اس کو ہندستان کی سب سے بڑی مسجد (The largest mosque in India) بتایا گیا ہے۔ مگر یہ تصویر اس کی جدید تکمیل سے پہلے کی ہے۔ چنانچہ اس میں موجودہ تاج المساجد کے بلند و بالا منارے موجود نہیں ہیں۔ میں تاج المساجد کے منتظمین سے گزارش کروں گا کہ وہ انسائیکلوپیڈیا کے اڈیٹروں کو اس کی تازہ تصویر روانہ کردیں تاکہ وہ اگلے اڈیشن میں اس کو شائع کرسکیں۔

بھوپال کی تاج المساجد اونچائی پر بنائی گئی ہے۔ نیز اس کے منارے غیر معمولی طور پر بلند ہیں۔ یہ منارے آزادی کے بعد کے دور میں بنائے گیے ہیں۔ بھوپال میں آپ کہیں بھی کھڑے ہوں، آپ کو سب سے زیادہ نمایاں چیز تاج المساجد دکھائی دے گی۔ تاج المساجد کے اونچے مینار تمام دوسری عمارتوں کے اوپر اس طرح ابھرے ہوئے دکھائی دیتے ہیں جیسے بونے آدمیوں کے درمیان چھ فٹ کا لمبا آدمی نمایاں طور پر کھڑا ہوا ہو۔

میں نے ایک تقریر میں کہا کہ یہ واقعہ ہندستان کے مسلمانوں کے لیے علامتی سبق ہے۔ وہ یہ کہ ہندستان میں مسلمانوں کے لیے بعض پہلوؤں سے ایسے مواقع پائے جاتے ہیں جو خود مسلم ممالک میں بھی موجود نہیں۔ آج کسی بھی مسلم ملک میں یہ ممکن نہیں کہ وہاں غیر مذہب کے لوگ اپنا عبادت خانہ اتنا اونچا بنائیں کہ وہ تمام دوسری عمارتوں (بشمول مساجد اور سرکاری دفاتر) سے اوپر اٹھ جائے۔ جب کہ مسلمانوں کو اس ملک میں یہ موقع پوری طرح حاصل ہے۔

ہندستان کی آزادی (۱۹۴۷) سے پہلے ملک کے دینی اور ملی اداروں کے لیے مالی تعاون کا سب سے بڑا ذریعہ دو تھا۔ ریاست حیدرآباد، اور ریاست بھوپال۔ آج دنیا بھر میں دینی اور ملی سرگرمیوں کو تعاون دینے کا سب سے بڑا ذریعہ اللہ تعالیٰ نے عرب پٹرول کو بنا رکھا ہے۔ مگر اُس وقت عربوں کا یہ حال تھا کہ وہ ایک ایسی قوم تھے جن کو خود باہری امداد کی ضرورت تھی۔ اس زمانے میں ہندستان سے عربوں کی مدد کے لیے رقمیں بھیجی جاتی تھیں۔ ہندستان کے ایک شہر میں ایک وقف "بیت المدینہ" کے نام سے قائم کیا گیا تھا۔ وقف نامہ کے مطابق اس کا خاص مقصد یہ تھا کہ اس کی آمدنی کو "غربا مدینہ" کی بہبود پر صرف کیا جائے۔ مگر آج کا حیدرآباد اور بھوپال اس سے مختلف ہے۔

بھوپال کے آخری فرماں روا نواب حمید اللہ خاں نے مولانا سید سلیمان ندوی کو قاضی ریاست کی حیثیت سے بھوپال بلایا تھا۔ سید صاحب زیادہ عرصہ تک بھوپال نہ رہ سکے۔ تاہم ان کے مختصر زمانہ قیام میں بعض ضروری کام ہوئے۔ ان کے مشورہ پر مولانا محمد عمران خاں صاحب نے یہاں ایک عربی مدرسہ قائم کیا جو کہ ندوہ کی شاخ کے طور پر کام کر رہا ہے۔ بھوپال میں دوسرا عربی مدرسہ جامعہ اسلامیہ (ترجمہ والی مسجد) کے نام سے مشہور ہے جو دارالعلوم دیوبند کے انداز پر چلایا جا رہا ہے۔

آزادی کے بعد جب بھوپال کی ریاست ختم ہوئی تو نواب حمید اللہ خاں صاحب نے نئی سرکار سے جو معاہدہ کیا اس میں ایک اہم بات یہ بھی شامل تھی کہ جن مساجد کے ائمہ و موذنین کی تنخواہ ریاست کے ذمہ تھی اس کی ذمہ داری نئی سرکار لے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور اب ریاست بھوپال کی تقریباً تین سو مساجد کے ائمہ و موذنین کی تنخواہ سرکاری گرانٹ سے دی جاتی ہے، اس میں دارالقضاء و دارالافتاء کا خرچ شامل ہے۔ ہر امام کی تنخواہ تین سو روپے، موذن کی ڈھائی سو اور قاضی کی دس سو روپے۔ موجودہ قاضی جناب مولانا وجدی الحسنی صاحب ہیں، اور مفتی شہر مولانا عبدالعلی صاحب ہیں۔ سرکار ایک کمیٹی تشکیل دیتی ہے جو یہ سارا انتظام کرتی ہے، اسے مساجد کمیٹی کہتے ہیں۔ اس کے موجودہ سکریٹری جناب عبدالکریم صاحب اور چیرمین جناب ملک حبیب صاحب ہیں۔ یہی مساجد کمیٹی ایک اسکول بھی چلاتی ہے۔ عربی بول چال کی ایک کلاس جس میں ڈاکٹر حمید اللہ ندوی تعلیم دیتے ہیں اس کا خرچ بھی اسی کمیٹی کے تحت ہے۔ اس وقت مساجد کمیٹی کو جو گرانٹ دی جاتی ہے اس کی مقدار چودہ لاکھ روپے ہے، پہلے صرف تین لاکھ تھی۔ یہ اضافہ سابق چیف منسٹر شری ارجن سنگھ کے زمانہ میں ہوا۔ معلوم ہوا کہ گرانٹ میں اضافہ

ہونے کے بعد بعض لوگوں نے صرف اس بات پر جھگڑنا شروع کر دیا کہ اس اضافہ کا سہرا کس کے سر بندھے۔ کئی لوگ اسے اپنی کوششوں کا نتیجہ قرار دینے لگے۔ اس کی وجہ سے یہاں کافی تلخ ماحول پیدا ہوگیا۔ خود چیف منسٹر صاحب بھی بددل ہوگئے۔ وہ چاہتے تھے کہ گرانٹ کی اس رقم میں مزید اضافہ کرائیں مگر جب انھوں نے مذکورہ حالات دیکھے تو اس کے بعد وہ خاموش ہوگئے (اس گرانٹ کا تعلق مرکزی حکومت سے ہے۔ ریاستی چیف منسٹر اس میں درمیانی رول ادا کرتے ہیں)

بھوپال میں تین دن کے دوران ۱۳ تقریریں ہوئیں۔ ہر تقریر میں توقع سے بہت زیادہ لوگ آئے۔ اور غیر معمولی تاثر کا اظہار کیا۔ مسلمانوں کے علاوہ ہندو صاحبان بھی اکثر اجتماعات میں شریک ہوئے۔

ایک ہندو بھائی سے ایک اجتماع کے بعد میں نے ان کا تاثر پوچھا۔ انھوں نے کہا: لوگ گنگا جل میں نہا کر پوتر ہوتے ہیں، آپ نے ہم کو اپنے شبدوں سے پوتر کر دیا۔ ایک ہندو بھائی نے ایک تقریر سننے کے بعد غیر معمولی پسندیدگی کا اظہار کرتے ہوئے کہا: اب تو ڈکشنری کے الفاظ ختم ہوگئے۔

ایک ہندو بھائی سے بات کرتے ہوئے میں نے کہا کہ وحدت وجود (Monism) کا عقیدہ صحیح نہیں۔ اس عقیدہ کا مطلب بظاہر یہ ہے کہ انسان خدا کا انش ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ ہم خدا کا حصہ نہیں ہیں اور نہ ہو سکتے ہیں۔ اکثر اس عقیدہ کو بتانے کے لیے سمندر اور قطرہ کی مثال دی جاتی ہے۔ سمندر اور قطرہ دونوں اپنی نوعیت کے اعتبار سے ایک ہیں۔ ان میں جو فرق ہے وہ کمیت کے اعتبار سے ہے نہ کہ کیفیت کے اعتبار سے۔ مگر یہ ناقابل تصور ہے کہ خدا اور انسان دونوں ایک ہی جنس سے تعلق رکھتے ہوں۔ صحیح بات یہ ہے کہ خدا اور انسان کے درمیان خود کیفیت کے اعتبار سے فرق ہے نہ کہ محض کمیت کے اعتبار سے۔

ایک اجتماع خاص طور پر شرعی قوانین کے مسئلہ پر ہوا۔ اس کا انتظام جناب خلیل اللہ خاں صاحب ایڈوکیٹ نے کیا تھا۔ لوگ بہت بڑی تعداد میں جمع ہوئے اور میری مفصل تقریر کو نہایت دل چسپی کے ساتھ آخر تک سنا۔

بھوپال کے تمام پروگرام غیر معمولی طور پر کامیاب رہے۔ ہر پروگرام میں شہر کا انتہائی تعلیم یافتہ طبقہ کثرت سے شریک ہوا جو اب تک کسی دینی اجتماع میں شریک نہیں ہوا تھا۔ اس غیر معمولی کامیابی کا خاص سبب الرسالہ کی اشاعت ہے۔ ڈاکٹر حمید اللہ ندوی اور ان کے ساتھیوں نے پچھلے دو سال میں الرسالہ کو شہر کے تعلیم یافتہ طبقہ میں پہونچانے کی زبردست جدوجہد کی ہے۔ یہی کام ہر مقام پر ہمارے

ساتھیوں کو کرنا چاہیے۔

بھوپال سے واپسی کے بعد خطوط کے ذریعہ معلوم ہوا کہ اس تین روزہ قیام میں بعض حضرات قریب سے میرا ذاتی مطالعہ کرتے رہے۔ ایک خط میں کہا گیا ہے "..... صاحب اب مزید آپ سے قریب ہوگیے ہیں۔ یہاں انھوں نے آپ کی ہر ہر بات، حتی کہ نشست و برخواست اور کھانے پینے تک کا بغور معائنہ کیا۔ ان کا کہنا ہے کہ آپ ایک کھنکھناتا ہوا سکہ ہیں" بھوپال کی تقریروں کے کیسٹ موجود ہیں۔ یہاں کے پروگرام بہت متنوع قسم کے تھے۔ ذیل میں پروگرام کا خاکہ دیا جاتا ہے۔

تاریخ	مقام	سامعین	موضوع
۱۹ اپریل ۱۹۸۶	رہائش گاہ پریم نارائن گپتا ایڈوکیٹ صدر منزل	وکیل صاحبان، اکثریت غیر مسلم	توحید
	رہائش گاہ ڈاکٹر عارفہ سیمیں	تعلیم یافتہ مسلم وغیر مسلم صاحبان	قرآن ایک عالمی پیغام
۲۰ اپریل	مسجد ٹی ٹی نگر	کالج کے اساتذہ اور پرنسپل	نوجوانوں کے مسائل
	پتر کار بھون	تعلیم یافتہ طبقہ	درسِ حدیث
	مدھیہ پردیش دینی تعلیمی کانفرنس	پریس کانفرنس	اسلامی مرکز کا تعارف
	انٹرنیشنل فرینڈس کلب	سنجیدہ اور تعلیم یافتہ اصحاب	تعمیر ملت
	مسجد تدسیہ بیگم	نوجوان طبقہ	نوجوانوں کے فرائض
	موتی مسجد	قارئین الرسالہ	الرسالہ کا پیغام
	گلشن محی الدین ریت گھاٹ	ایجوکیشنل سوسائٹی	تعمیر ملت
۲۱ اپریل	رہائش گاہ سلیم شمسی صاحب	نوجوان اور تعلیم یافتہ طبقہ	شریعت کا دائمی پہلو
	مدینہ ہوٹل	تعلیم یافتہ اصحاب	احیاء اسلام
	دین دیال وچار پرکاشن	مسلم اور غیر مسلم نوجوان	اسلام کا تعارف
	رہائش گاہ عفران اعظم	جنتا پارٹی کے کارکن اور ذمہ دار	اسلام کیا ہے
		اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقہ، مسلم وغیر مسلم	بھارت کی تعمیر

بھوپال کے اجتماع کی خبر سن کر اطراف کے علاقوں کے بھی کچھ لوگ بھوپال آگیے تھے۔ ایک قریبی شہر سے آنے والے ایک نوجوان نے بتایا کہ وہ اردو الرسالہ کے علاوہ ۲۰ عدد انگریزی الرسالہ ہر ماہ منگاتے ہیں اور اس کو غیر مسلموں میں پھیلاتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ "پہلے صرف مسلمان الرسالہ کا انتظار کرتے تھے۔ اب غیر مسلم بھی الرسالہ کا انتظار کرتے ہیں"۔ الرسالہ انگریزی کے ایک غیر مسلم قاری کا تاثر انھوں نے ان الفاظ میں نقل کیا، یہ بہت اچھا پرچہ ہے عقل و فطرت کے خلاف کوئی بات نہیں"۔ ایک صاحب نے کہا کہ مسلمانوں کے دوسرے پرچے ایسے ہوتے ہیں کہ ان سے صرف ان کے مخصوص حلقہ کو دل چسپی ہو سکتی ہے۔ الرسالہ واحد پرچہ ہے جو ہر ایک کی دل چسپی کا ہوتا ہے۔ الرسالہ کو کسی بھی شخص کے ہاتھ میں اطمینان کے ساتھ دیا جا سکتا ہے۔

۲۰ اپریل ۱۹۸۶ کو پتر کار بھون میں پریس کانفرنس ہوئی۔ اس میں اردو، ہندی اور انگریزی اخبارات کے نمائندے بڑی تعداد میں شریک ہوئے۔ اس پریس کانفرنس کو یو این آئی اور پی ٹی آئی دونوں نے کور کیا تھا۔ اس لیے اس کی رپورٹ بھوپال اور بھوپال کے باہر کے اکثر اخبارات میں شائع ہوئی، دہلی کے انگریزی اخبار ٹائمس آف انڈیا (۲۱ اپریل ۱۹۸۶) میں جو رپورٹ شائع ہوئی تھی اس کو یہاں نقل کیا جاتا ہے:

Bhopal, April 20 (UNI): The Muslim Women (Divorce) Bill introduced in the Lok Sabha does not contravene the Shariat says a well-known Islamic theologian. Maulana Waheeduddin Khan head of New Delhi based Islamic centre told newsmen here today that Islam held women in high esteem and provisions in the Shariat clearly define the status of Muslim women. The protection provided to Muslim women would be further strengthened by the Bill when it becomes law, he added. Referring to the Shahbano case, the Maulana said it was more a social than a legal problem. He said that the maintenance provided by the Supreme Court to Shahbano would not be sufficient. If the issue had been decided through arbitration, Shahbano would have had a better deal, he said. The Maulana said former Chief Justice Chandrachud had misquoted from the Hadees in the Supreme Court decision. 'The reference to women as the rib of man has been misquoted by the learned judge.' "The comparison has been done to point out to Muslims that a woman was like a rib which would break if straightened out. Thus a woman should be respected and loved as you love your body.", the Maulana explained claiming that it was not a reference derogatory to the fair sex. The Maulana said it was wrong to say that the Shariat or the Muslim personal law was not codified.

The Times of India, 21 April 1986

۲۱ اپریل ۱۹۸۶ کو ایک عیسائی مسٹر جارج (M.O. George) کی رہائش گاہ پر جانے کا اتفاق ہوا۔ موصوف یہاں بنک منیجر ہیں۔ مکان نہایت صاف ستھرا تھا۔ ہر چیز میں صفائی اور قرینہ جھلک رہا تھا ایک دیوار پر ایک چوکھٹے میں فریم کی ہوئی تصویر نظر آئی۔ دیکھا تو وہ حضرت مسیح کی تصویر تھی۔ اس تصویر کے نیچے انگریزی میں یہ جملہ لکھا ہوا تھا :

Christ is the head of this house, the unseen guest, at every meal, the silent listener to every conversation.

مسیح اس گھر کے سردار ہیں۔ ہر کھانے کے ساتھ نہ دکھائی دینے والے مہمان، ہر گفتگو کو خاموشی کے ساتھ سننے والے ـــــ یہ مسیح کے بارہ میں عیسائی حضرات کا عقیدہ ہے۔ انھوں نے اپنے پیغمبر کے لیے خدائی اوصاف فرض کر رکھے ہیں۔ مگر عجیب بات ہے کہ مسلمان بھی اس معاملہ میں ان سے پیچھے نہیں۔ انھوں نے بھی اپنے پیغمبر کے لیے ایسے عقیدے بنا لیے ہیں جس کے بعد خدا اور بندہ میں کوئی فرق باقی نہیں رہتا۔

بھوپال کی ملاقاتوں میں سے ایک خاص ملاقات حضرت پیر سعید میاں صاحب مجددی کی تھی۔ آپ خانقاہِ مجددیہ کے سجادہ نشین ہیں۔ یہ خانقاہ حضرت شاہ پیر ابو احمد صاحب (۱۳۴۲ - ۱۲۶۰ھ) کے زمانہ سے قائم ہے اور مسلسل عوام و خواص کا مرجع بنی رہی ہے۔

حضرت پیر سعید میاں صاحب قبلہ نے بہت سی قابل قدر دینی باتیں بتائیں۔ آپ نے بتایا کہ ایک بار حضرت شاہ عبد القادر رائے پوریؒ لاہور میں مقیم تھے۔ آپ نے پیغام بھیج کر مولانا علی میاں صاحب اور مولانا منظور نعمانی صاحب کو لاہور بلوایا۔ دونوں حضرات گیے اور حضرت رائے پوری کے ساتھ ٹھہرے۔

ایک بار قیام گاہ پر شہر کے کافی لوگ جمع تھے۔ لوگ چاروں طرف منتظر بیٹھے ہوئے تھے مگر حضرت رائے پوری بالکل خاموش تھے۔ مولانا علی میاں نے چاہا کہ کسی طرح سکوت ٹوٹے اور حضرت رائے پوری کچھ فرمائیں جس سے حاضرین مستفید ہوں۔ چنانچہ مولانا علی میاں نے حضرت رائے پوری سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا کہ حضرت قرآن میں صبر کا بار بار ذکر ہے اور اس کی بہت تعریف آئی ہے۔ کچھ اس کے بارہ میں ارشاد فرمائیں۔ حضرت رائے پوری دو منٹ خاموش رہے۔ پھر کہا کہ آپ ہی فرما دیجئے۔ مولانا علی میاں نے کہا کہ حضرت ہم کو صبر کا اتنا ہی مطلب معلوم ہے جو لغت کی کتابوں میں لکھا ہوا ہے۔ اس پر

حضرت رائے پوری دوبارہ کچھ دیر خاموش رہے اور پھر فرمایا: ہم کو تو اتنا بھی نہیں معلوم۔

مجھے کھانے پینے کی دھوم سے کوئی دل چسپی نہیں۔ حتی کہ پر تکلف دستر خوان پر جہاں اکثر لوگ معمول سے زیادہ کھاتے ہیں، میں معمول سے کم کھانے کی وجہ سے اکثر بھوکا رہ جاتا ہوں۔ بیرون ملک کی ایک بین اقوامی کانفرنس میں اسی "کم خوری" کی وجہ سے مجھے قبض ہوگیا۔ میں طبی کمرہ میں گیا اور کہا کہ مجھے قبض کی کوئی دوا دیدیجئے۔ بڑے کمرہ میں کافی دوائیں بھری ہوئی تھیں۔ مگر ڈاکٹر صاحب کافی تلاش کے باوجود قبض کی دوا نہ پا سکے۔ میں نے کہا کہ آپ کے یہاں تو دواؤں کا زبردست اسٹاک ہے۔ پھر آپ کے پاس قبض کی دوا کیوں نہیں۔ انھوں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا "ہمارے پاس تو زیادہ تر دست کے کیس آرہے ہیں"۔

بھوپال میں مختلف لوگوں نے اپنے مکانات پر کھانے کا انتظام کیا۔ اور اس میں معززین شہر کو مدعو کیا۔ مثلاً سلیم شمسی صاحب، ڈاکٹر عارفہ سیمیں صاحبہ، ڈاکٹر حمید اللہ ندوی وغیرہ۔ ان مواقع پر شہر کا خواص کا طبقہ اکٹھا ہوگیا۔ مثلاً مقامی ایم ایل اے، اخبارات کے ذمہ دار، ڈاکٹر، وکلار اور اساتذہ صاحبان۔ جناب عفران اعظم ایم پی کے والد جناب محمد اعظم صاحب نے بھی اپنے یہاں کھانے کی ایک مجلس رکھی۔ محمد اعظم صاحب شروع سے الرسالہ کو پسند فرماتے رہے ہیں اور مقامی طور پر الرسالہ کی تحریک سے وابستہ ہیں۔

ان مجالس میں اعیان شہر سے ملاقات کے مواقع ملے جو کسی اور صورت میں یکجائی طور پر کم ہی ملتے ہیں۔ جناب نور محمد صاحب (ٹی ٹی نگر) کے یہاں کھانے پر محکمۂ تعلیمات کے ڈپٹی ڈائرکٹر سے ملاقات ہوئی اور تبادلۂ خیال ہوا۔

بھوپال میں ڈاکٹر حمید قریشی (سابق منسٹر) سے ملاقات ہوئی۔ ہندستان کی جدید سیاسی تاریخ سے ان کا گہرا تعلق رہا ہے۔ میں نے ان سے پوچھا کہ مہاتما گاندھی کی کیا خصوصیت تھی کہ وہ ملک کی سیاست پر چھا گئے انھوں نے کہا کہ ٹالرینس (برداشت)۔ انھوں نے بتایا کہ شملہ کانفرنس میں ایک بار گاندھی اور جناح دونوں وائسرائے سے بات چیت کرکے باہر نکلے تو گاندھی جی نے جناح صاحب سے کہا کہ آیئے، ہم دونوں ایک ساتھ چلیں۔ مگر جناح صاحب نے گاندھی جی کی گاڑی میں بیٹھنے سے انکار کر دیا۔ اس کے بعد گاندھی جی نے کہا کہ جناح صاحب، اگر آپ میری گاڑی میں نہیں بیٹھتے تو میں ہی آپ کی گاڑی میں بیٹھتا ہوں

اور پھر وہ جناح صاحب کے ساتھ بیٹھ کر واپس آ گئے۔

میں نے ڈاکٹر حمید قریشی سے کہا کہ گاندھی جی کے بارہ میں دو انتہائی مختلف قسم کی رائیں ہیں۔ کچھ لوگ ان کو نہایت مخلص سمجھتے ہیں اور کچھ لوگ ان کو سیاسی اداکار کہتے ہیں۔ ڈاکٹر حمید قریشی نے میرا سوال سن کر ایک لمحہ سوچا اور اس کے بعد کہا: گاندھی جی اگر اداکار تھے تو ان سے بڑھ کر دنیا نے کوئی دوسرا اداکار پیدا نہیں کیا۔

بھوپال کی ملاقاتوں میں سے ایک ملاقات جناب پریم نارائن گپتا ایڈوکیٹ کی تھی۔ گفتگو کے دوران انھوں نے ایک بڑا عجیب واقعہ بتایا۔

مسٹر گپتا نے کہا کہ اندرا گاندھی کے قتل سے کچھ پہلے بھوپال کے وکیلوں کا ایک وفد ان سے دہلی میں ملا تھا۔ اس وفد میں میں بھی شریک تھا۔ اس وقت اتفاق سے میرے ہاتھ میں قرآن کا ایک نسخہ تھا۔ مسز اندرا گاندھی جب باہر آئیں تو وفد سے ملنے ہوسے وہ میرے پاس کھڑی ہو گئیں۔ انھوں نے پوچھا کہ یہ کون سی کتاب ہے، میں نے کہا کہ قرآن۔ اس کے بعد انھوں نے فوراً قرآن پر گفتگو شروع کر دی۔ مقررہ وقت کا تقریباً پورا حصہ انھوں نے میرے ہی پاس کھڑے کھڑے گزارا اور پورے وقت میں وہ صرف قرآن پر گفتگو کرتی رہیں۔ انھوں نے کہا کہ میں قرآن کو پڑھنا چاہتی ہوں۔ مگر اسی کے ساتھ میں تقابل بھی کرنا چاہتی ہوں۔ یعنی میں جاننا چاہتی ہوں کہ قرآن میں کیا ہے اور دوسری مذہبی کتابوں میں کیا۔ انھوں نے بار بار مجھ سے کہا کہ کیا اس سلسلہ میں آپ میری مدد کریں گے۔

مسٹر پریم نارائن گپتا سے یہ بات سن کر مجھے زبردست جھٹکا لگا۔ میں نے سوچا کہ مسز اندرا گاندھی کے طویل زمانۂ حکومت میں بے شمار مسلمان قائدین ان سے ملے، جن میں باریش قائدین بھی تھے اور بے ریش قائدین بھی۔ مگر یہ سارے مسلم قائدین سابق وزیر اعظم کے سامنے صرف اپنی "قومی کتاب" پیش کرتے رہے۔ انھوں نے ان کے سامنے کبھی خدا کی کتاب پیش کرنے کی کوشش نہیں کی۔

ان قائدین میں سے ہر شخص مسز اندرا گاندھی سے صرف اس لیے ملا کہ وہ ان کے سامنے مسلمانوں کی شکایات پیش کرے۔ وہ ان کے سامنے مسلمانوں کے معاشی اور سیاسی مطالبات رکھے۔ وہ مسلمانوں کے مادی مفادات کا میمورنڈم ان کے حوالے کرے۔ مسلم قائدین میں سے کوئی ایک بھی قائد نہیں جس نے ایسا

کیا ہو کہ وہ اپنی رات کی تنہائیوں میں نمازیں پڑھ کر مسز اندرا گاندھی کی ہدایت کے لیے دعا کرے۔ صبح کو اٹھ کر وہ دو رکعت صلوٰۃ الحاجہ پڑھے اور رو رو کر اللہ سے مدد کی درخواست کرے۔ اس کے بعد وہ قرآن کا ترجمہ لے کر مسز اندرا گاندھی کے یہاں جائے اور درد و سوز کے انداز میں ان سے گفتگو کر کے انھیں خدا کی کتاب پیش کرے۔ مسلمان قائدین نے ایسا نہیں کیا۔ یہاں تک کہ مسز اندرا گاندھی اس دنیا سے چلی گئیں۔

مسلم قائدین کی اس کوتاہی کو صرف کوتاہی یا غلطی کہنا مسئلہ کی اہمیت کو گھٹانا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ دور جدید میں ان کا سب سے بڑا جرم ہے۔ اور یہ وہ جرم ہے جس میں ہمارے تمام اصاغر اور اکابر یکساں طور پر شریک ہیں۔

۲۲ اپریل ۱۹۸۶ کو انڈین ایرلائنز (IC 460) کے ذریعہ بھوپال سے دہلی واپسی ہوئی۔ جہاز کے اندر اعلان کے دوران کہا گیا :

Captain Javed is in command

(کپتان جاوید اس جہاز کے پائلٹ ہیں) دوسرے لفظوں میں یہ کہ جس جہاز کے ذریعہ میں بھوپال سے دہلی آیا اس کے اڑانے والے ایک مسلمان تھے۔ اس طرح کے واقعات آج ہندستان کے ہر شعبہ میں موجود ہیں اور لوگوں کے علم میں آتے ہیں مگر کوئی نہیں جو ان کو قابلِ ذکر سمجھتا ہو۔ مسلمانوں کے تمام لکھنے والے اور تمام بولنے والے صرف اس "جاوید" سے واقف ہیں جو کسی وجہ سے سرکاری سروس میں پہونچنے میں ناکام ہو گیا ہو۔ وہ اس "جاوید" سے واقف نہیں جو اعلیٰ سرکاری سروس میں ہے اور اس کو وہی تمام حقوق حاصل ہیں جو کسی دوسرے ہندستانی شہری کو حاصل ہو سکتے ہیں۔

اجتماع کے بعد بھوپال سے کچھ خطوط ملے ہیں۔ ان میں سے ایک خط کو یہاں نقل کیا جاتا ہے۔

"آپ کے پروگرام میں جو دیشیتا پائی وہ اسلام بنام پرم پرا، یا دھرم بنام پرم پرا واد نہیں ہے۔ آج کا انسان سائنٹفک دور سے گزر رہا ہے جس میں پرم پرا واد دم توڑ چکا ہے۔ دھرم کے پرانے ٹھیکیدار مُردے گھوڑے کو کوڑے مار مار کر کب تک زندہ رکھ سکیں گے، اس پر نظریں اٹھنے لگیں تھیں۔ ایشور کی کرپا سے دھارمک جگت میں ایک ستارہ نظر آیا ہے اور وہ ستارہ آپ ہیں جس کی وجہ سے جو ویکوم پیدا ہو چلا تھا اس بھونچال کے لاوے میں دب گیا ہے۔ آج کی زندگی کا ہر پہلو پیاسا ہے اور وہ پیاس تب

تک نہیں بجھتی جب تک اسے حقیقت کے پیالے سے نہ ملایا جائے۔ یہ آپ کی اپروچ کا مشن ہے۔ آپ کے لٹریچر یا بھاشن میں کیول اسلام ہی نہیں سب مذہبوں کی روحیں زندہ رہیں، ایسا سندیش ملتا ہے جب روحیں زندہ ہو جائیں گی تب پنڈت واد ختم ہو جائے گا۔ اور جب پنڈت واد ختم ہو جائے گا تب دھرم واد کے کھلے درشن ہو جائیں گے۔

شری برج کشور ایڈوکیٹ ہندو پریشد کے سکریٹری نے فرمایا کہ ہم انگور کھاتے ہیں گریپس کہنے والوں سے لڑ بیٹھتے ہیں۔ حضرت مولانا نے اپنے بھاشن میں ہماری آنکھیں بند کروا کر منہ میں دانا رکھ دیا اور فرمایا منہ بند کیجیے، ہم نے منہ بند کیا تو وہی انگور کا رس، مٹھاس ٹھنڈک سب موجود تھے۔ مولانا صاحب نے کہا یہ وہی گریپس ہیں۔ جس کو آپ کچھ کا کچھ سمجھ بیٹھے تھے۔"

پریم نارائن گپتا ایڈوکیٹ، بھوپال

بھوپال سے واپسی کے بعد "برطانیہ میں اسلام" کے بارہ میں ایک رپورٹ پڑھنے کا اتفاق ہوا۔ اس میں پہلی بار یہ خبر پڑھی کہ برطانیہ کی سب سے قدیم مسجد جو ووکنگ میں ہے، وہ بھوپال کی خاتون نواب سلطان جہاں بیگم کی طرف سے ۱۸۹۰ میں تعمیر کرائی گئی تھی ——— بھوپال ہندستان کی نسبتاً ایک چھوٹی ریاست تھی، مگر اس کے حکمرانوں کی عالی ہمتی نے ان سے بڑے بڑے کام لے لیے۔ اس دنیا میں بڑے کام اکثر بڑے دل والے لوگ کرتے ہیں نہ کہ بڑے وسائل والے لوگ۔

قیمت میں اضافہ

سابقہ اعلان کے مطابق الرسالہ اردو اور انگریزی کی قیمت میں جنوری ۱۹۸۷ سے اضافہ کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ جنوری ۱۹۸۷ سے الرسالہ کی قیمتیں حسب ذیل ہوں گی۔

فی شمارہ — چار روپیہ

سالانہ — ۴۸ روپیہ

اسی نسبت سے ایجنسی کی قیمتوں میں بھی اضافہ ہو جائے گا۔

توحید اور شرک

انسانوں میں دو قسم کے انسان ہوتے ہیں۔ ایک خدا کی سطح پر جینے والا۔ دوسرا غیر خدا کی سطح پر جینے والا۔ پہلا انسان مذہب توحید پر ہے اور دوسرا انسان مذہب شرک پر۔ پہلے انسان کا نام موحد ہے اور دوسرے انسان کا نام مشرک۔

یہ فرق اس اعتبار سے پیدا ہوتا ہے کہ کون آدمی کس کو سب سے زیادہ اہم سمجھتا ہے، کون آدمی کس کی عظمتوں سے سب سے زیادہ متاثر ہے، کون آدمی کس چیز کو اپنی زندگی میں آخری درجہ دیئے ہوئے ہے۔ اسی نفسیاتی حالت کو مذہب کی اصطلاح میں عقیدہ کہا جاتا ہے یہی عقیدہ کا فرق ایک انسان کو دوسرے انسان سے الگ کر دیتا ہے۔ ایک قسم کے عقیدہ والا خدا پرست بن جاتا ہے اور دوسرے قسم کے عقیدہ والا غیر خدا پرست۔

جو انسان خدا کے عقیدہ پر ہو وہ خدا کی بڑائیوں میں جینے والا انسان ہوتا ہے۔ اس کی محبتیں اور اس کے اندیشے خدا سے وابستہ ہوتے ہیں۔ اس کی یادوں میں خدا کا وجود بسا ہوا ہوتا ہے، وہ خدا کی آنکھ سے دیکھتا ہے، وہ خدا کے کان سے سنتا ہے اور خدا کے ذہن سے سوچتا ہے، اس کے تمام اقوال اور افعال پر خدا کا رنگ چھایا ہوا نظر آتا ہے۔ وہ جس چیز کو چھوڑتا ہے خدا کے لیے چھوڑتا ہے، وہ جس چیز کو اختیار کرتا ہے خدا کے لیے اختیار کرتا ہے۔ وہ ہر اعتبار سے خدا میں جینے والا انسان بن جاتا ہے۔

جو انسان شرک کے عقیدہ پر ہو اس کا معاملہ اس کے بالکل برعکس ہوتا ہے۔ اس کے ذہن میں دوسری دوسری چیزوں کی عظمتیں سمائی ہوئی ہوتی ہیں۔ یہ دوسری چیزیں خواہ سورج اور چاند ہوں، خواہ وہ مفروضہ روحیں ہوں، خواہ وہ قوم کے بزرگ اور اکابر ہوں، خواہ وہ اس کی اپنی ذات یا اس کے بیوی بچے ہوں۔ ایسے انسان کا ذہن ہمیشہ انھیں غیر خدائی چیزوں پر چلتا ہے، وہ انھیں کی یادوں میں تڑپتا ہے۔ اس کے حوصلے اور عزائم ہمیشہ انھیں چیزوں کے گرد گھومتے ہیں۔ اس کا غم اور اس کی خوشی سب انھیں چیزوں سے وابستہ ہو جاتی ہیں۔ یہی چیزیں اس کی زندگی کا رُخ متعین کرتی ہیں۔

۱۔ الرسالہ کی ڈاک میں خدا کے فضل سے تقریباً روزانہ ایسے خطوط موصول ہوتے ہیں جن میں یہ لکھا ہوا ہوتا ہے کہ میں نے فلاں موقع پر اتفاقاً الرسالہ دیکھا۔ مجھ کو بہت پسند آیا۔ میرے نام الرسالہ جاری کر دیا جائے۔ اس سے الرسالہ کی فکری تاثیر کا اندازہ ہوتا ہے۔ ذیل میں اسی قسم کا ایک خط (۵ ستمبر ۱۹۸۶) یہاں نقل کیا جاتا ہے :

I happened to go through your esteemed magazine ALRISALA (English) at Shri Aziz Ahmad Siddiqi Advocate's office. I appreciate the idea being presented through the magazine. The vision presented is multi-dimention and would enlighten the society. Kindly make arrangement to send and English copy of 'Al-Risala' at the below mentioned address.

Robert Anthony, Advocate, 38 Ladies Hospital, Bhopal.

۲۔ حیدرآباد سے اطلاع ملی ہے کہ وہاں چند اجتماعات میں اسلامی مرکز کی مطبوعات کا بک اسٹال لگایا گیا۔ خدا کے فضل سے لوگوں نے کافی دلچسپی لی اور کتابیں حاصل کیں۔ ان لوگوں نے ٹیلی فون سروس بھی قائم کی ہے۔ یعنی کتابوں کا طالب ٹیلی فون پر آرڈر دے کر کتابیں منگالے۔ یہ اسکیم بھی کامیاب ہے۔ ضرورت ہے کہ دوسرے بڑے شہروں میں بھی اس طریقہ کو اختیار کیا جائے۔

۳۔ ۴ اگست سے ۱۴ اگست تک سری نگر میں کتابوں کی آل انڈیا نمائش تھی۔ اس موقع پر اسلامی مرکز کی کتابوں کا اسٹال بھی رکھا گیا۔ خدا کے فضل سے غیر معمولی کامیابی رہی۔ اسلامی مرکز کے اسٹال پر شروع سے آخر تک سب سے زیادہ مجمع رہا۔ کتابوں کا جو اسٹاک رکھا گیا تھا وہ سب ختم ہو گیا اور مانگ برابر جاری رہی۔

۴۔ حج کمیٹی بمبئی کی طرف سے حج پر ایک ڈاکومنٹری فلم بنائی جا رہی ہے جس کا نام ہوگا "آخری جہاز"۔ اس سلسلے میں اس کے ذمہ داران مختلف حلقہ کی نمایاں شخصیتوں سے انٹرویو لے رہے ہیں۔ چنانچہ ۱۱ ستمبر ۱۹۸۶ کو اس کی پارٹی مرکز میں آئی اور صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو حج اور قربانی کے موضوع پر ریکارڈ کیا۔

۵۔ افریقہ کی ایک عالمی اسلامی کانفرنس (۱۵ ستمبر — ۲۰ ستمبر ۱۹۸۶) کی دعوت پر صدر

اسلامی مرکز نے کانفرنس میں شرکت کی اور وہاں اپنا مقالہ پیش کیا۔ مقالہ اور مفصل روداد سفر آئندہ الرسالہ میں شائع کر دی جائے گی۔ انشاء اللہ

۶۔ پاکستان کے ایک ادارہ نے اسلامی مرکز کی بیس کتابیں شائع کی ہیں۔ انھوں نے اطلاع دی ہے کہ جو شخص ایک کتاب پڑھ لیتا ہے وہ پورا سٹ حاصل کرنے کا مطالبہ کرتا ہے۔ یہ ادارہ جلد ہی اسلامی مرکز کی تمام کتابیں شائع کرنا چاہتا ہے، اس کا پتہ یہ ہے:

فضلی سنز لیمٹڈ، اردو بازار، کراچی (پاکستان)

۷۔ یہ الرسالہ کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا فضل خاص ہے کہ اس نے الرسالہ کو لوگوں کے لیے اکتشافِ حق کا ذریعہ بنایا۔ اس کا اندازہ روزانہ خطوط اور ملاقاتوں کے ذریعہ ہوتا رہتا ہے۔ ایک صاحب جو سعودی عرب میں رہتے ہیں، اپنے خط مورخہ ۲۸ جولائی ۱۹۸۶ میں لکھتے ہیں: آپ کی کتاب "حل یہاں ہے" پڑھا اور آپ کے دو کیسٹ سنے۔ جزاکم اللہ میں چالیس برس سے حل کی تلاش میں تھا۔ آپ نے حل کر دیا۔ کیسٹ سن کر آنکھیں بھی کھل گئیں اور دل کے دروازے بھی۔

۸۔ اسلامی مرکز کا پیغام الرسالہ اور مطبوعات الرسالہ کے علاوہ بالواسطہ انداز میں بھی مختلف طریقوں سے پھیل رہا ہے۔ ملک کے اندر اور ملک کے باہر متعدد جرائد برابر الرسالہ کے مضامین شائع کر رہے ہیں۔ مثال کے طور پر لاہور کا ماہنامہ "اشراق" اپنی ہر اشاعت میں الرسالہ کے ایک یا ایک سے زیادہ مضامین شائع کر رہا ہے۔ وغیرہ

۹۔ جکارتہ (انڈونیشیا) میں اگست ۱۹۸۶ میں اسلامی کتابوں کی نمائش ہوئی۔ اس موقع پر منتظمین کی طرف سے جو کتابیں نمائش کے لیے رکھی گئیں ان میں اسلامی مرکز کی عربی اور انگریزی اور انڈونیشی مطبوعات بھی شامل تھیں۔

۱۰۔ اس وقت اسلامی مرکز کی اشاعتی اسکیم کے تحت کئی کتابیں زیر طبع ہیں (۱) تذکیر القرآن جلد دوم، سورہ الکہف تا سورہ الناس (۲) خاتونِ اسلام، خواتین کے مسئلہ پر اسلامی تعلیمات کی مدلل وضاحت۔ (۳) رازحیات، تعمیری مضامین کا مجموعہ۔ (۴) مذہب اور جدید چیلنج کا انگریزی ترجمہ مع اضافہ۔ (۵) انسان اپنے آپ کو پہچان اور حقیقت کی تلاش کا ہندی ترجمہ۔ وغیرہ۔

ایجنسی الرسالہ

ماہنامہ الرسالہ بیک وقت اردو اور انگریزی زبانوں میں شائع ہوتا ہے۔ اردو الرسالہ کا مقصد مسلمانوں کی اصلاح اور ذہنی تعمیر ہے۔ اور انگریزی الرسالہ کا خاص مقصد یہ ہے کہ اسلام کی بے آمیز دعوت کو عام انسانوں تک پہونچایا جائے الرسالہ کے تعمیری اور دعوتی مشن کا تقاضا ہے کہ آپ نہ صرف اس کو خود پڑھیں بلکہ اس کی ایجنسی لے کر اس کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں دوسروں تک پہونچائیں۔ ایجنسی گویا الرسالہ کے متوقع قارئین تک اس کو مسلسل پہونچانے کا ایک بہترین درمیانی وسیلہ ہے۔

الرسالہ (اردو) کی ایجنسی لینا ملت کی ذہنی تعمیر میں حصہ لینا ہے جو آج ملت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اسی طرح الرسالہ (انگریزی) کی ایجنسی لینا اسلام کی عمومی دعوت کی مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنا ہے جو کار نبوت ہے اور ملت کے اوپر خدا کا سب سے بڑا فریضہ ہے۔

ایجنسی کی صورتیں

۱۔ الرسالہ (اردو یا انگریزی) کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ کمیشن ۲۵ فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے تمام اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمے ہوتے ہیں۔

۲۔ زیادہ تعداد والی ایجنسیوں کو ہر ماہ پرچے بذریعہ وی پی روانہ کیے جاتے ہیں۔

۳۔ کم تعداد کی ایجنسی کے لیے ادائگی کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ پرچے ہر ماہ سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور صاحب ایجنسی ہر ماہ اس کی رقم بذریعہ منی آرڈر روانہ کردے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ چند ماہ (مثلاً تین مہینے) تک پرچے سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور اس کے بعد والے مہینہ میں تمام پرچوں کی مجموعی رقم کی وی پی روانہ کی جائے۔

۴۔ صاحب استطاعت افراد کے لیے بہتر یہ ہے کہ وہ ایک سال یا چھ ماہ کی عمومی رقم پیشگی روانہ کردیں اور الرسالہ کی مطلوبہ تعداد ہر ماہ ان کو سادہ ڈاک سے یا رجسٹری سے بھیجی جاتی رہے۔ ختم مدت پر وہ دوبارہ اسی طرح پیشگی رقم بھیج دیں۔

۵۔ ہر ایجنسی کا ایک حوالہ نمبر ہوتا ہے۔ خط و کتابت یا منی آرڈر کی روانگی کے وقت یہ نمبر ضرور درج کیا جائے۔

زر تعاون الرسالہ

زر تعاون سالانہ	۳۶ روپیہ
خصوصی تعاون سالانہ	۲۰۰ روپیہ

بیرونی ممالک سے

ہوائی ڈاک	۲۰ ڈالر امریکی
بحری ڈاک	۱۰ ڈالر امریکی

ڈاکٹر ثانی اثنین خاں پرنٹر پبلشر مسئول ینجے کے آفسٹ پرنٹرز دہلی سے چھپوا کر دفتر الرسالہ سی۔ ۲۹ نظام الدین ویسٹ نئی دہلی سے شائع کیا

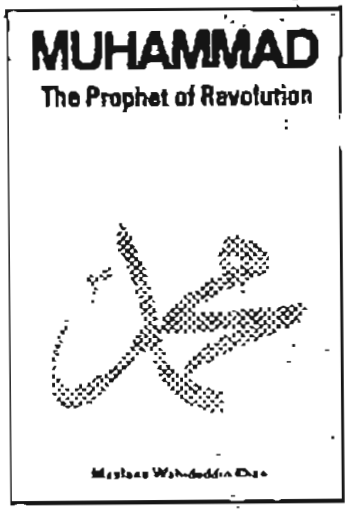

MUHAMMAD

The Prophet of Revolution

By

Maulana Wahiduddin Khan

In making the Prophet Muhammad the greatest figure, and consequently one of the most resplendent landmarks in human history, God has bestowed his greatest favour on mankind. Whoever seeks guidance cannot fail to see him, for he stands out like a tower, a mountain on the horizon, radiating light like a beacon, beckoning all to the true path. It is inevitable that the seekers of truth will be drawn up to the magnificent pinnacle on which he stands.

ISBN 81-85063-00-1 (PB Rs 50 $ 5)
ISBN 81-85063-07-9 (HB Rs 90 $ 9)

Maktaba Al-Risala
C-29 Nizamuddin West New Delhi-110013

Regd. R.N. No. 28822/76 Number 120

GIFTING The Word of God

To spread the word of God is the highest form of charity. It appeals to the mind, the heart, the soul, that being the earnest endeavour of this magazine, how noble-spirited it would be of you, dear readers, if you sent it on regularly to friends and relatives. Make a **GIFT** of it. Think of a whole year's subscription as being both a delightful present as well as a contribution to a worthy cause.

Please send AL-RISALA to my friend/ relative to the following address:

Name .....

Address .....

.....

.....

I am enclosing cheque/Postal Order/ Bank Draft/M.O. Receipt No. .....

Please tick box where applicable

- ☐ URDU
- ☐ ENGLISH
- ☐ ONE YEAR
- ☐ TWO YEARS

SUBSCRIPTION RATES: (Prices include postage)

INLAND	Rs. 36
ABROAD	
By air-mail	$ 20
By surface mail	$ 10

Please send this together with the payment to the Circulation Manager ALRISALA C-29 Nizamuddin West New Delhi 110 013

Rs. 3.00